وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ

سہ ماہی البیان کراچی

سلسلہ نمبر 19 اجراء:

انتہا پسندی

کے انسداد میں سلفی عقائد کا کردار

سود

کے احکام آج کے حالات میں کیسے لاگو ہو سکتے ہیں؟

علامتِ قیامت

کی تفسیر و تطبیق کے شرعی اصول ضابطے

عدالت عظمی

62-63 کا فیصلہ اور دفعات



مجلس البحث العلمي

المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر

 albayanmirc@gmail.com  +92-21-35896959  www.islamfort.com

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

سہ ماہی البیان کراچی

سلسلہ نمبر 19
جولائی تا ستمبر 2017
اجراء: اکتوبر 2017

سرپرست اعلیٰ: فضیلۃ الشیخ علامہ عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ

مدیر اعلیٰ: فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن لکھوی حفظہ اللہ

فہرست مضامین

زرِ تعاون بھیجنے کے لیے اور **البیان** کے شمارہ جات جاری کروانے کے لیے ذیل میں دیئے گئے پتہ پر بذریعہ منی آرڈر رقم ارسال کریں نیز بذریعہ ایزی پیسہ اور آن لائن بھی رقم ارسال کر سکتے ہیں۔

تفصیلات کے لیے رابطہ: محمد کامران یاسین/ 03222056928

زرِ تعاون شمارہ: 120 روپے — سالانہ بکنگ پر خصوصی رعایت

بیرون ملک: زرِ سالانہ 12 ڈالر، فی شمارہ 3 ڈالر (علاوہ ڈاک خرچ)

Bank Al-Habib A/C No:1103-0081-002746-01-2

المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر
AL-Madina Islamic Research Center
مسجد سعد بن ابی وقاص ڈیفنس فیز 4، 11 کمرشل اسٹریٹ
نزد شار شہید پارک وگذری پولیس اسٹیشن کراچی

Ph:+92-21-35896959
Mob 03322135693
WEBSITE:
WWW.ISLAMFORT.COM
E-MAIL:
albayanmirc@gmail.com

عدالتِ عظمیٰ کا فیصلہ

اور آئین کی دفعات 63-62[1]

حافظ صلاح الدین یوسف

سوال: کیا ملک کے ذمے داران اور عوامی نمائندوں کا صادق اور امین ہونا ضروری ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ صادق اور امین صرف نبی ہی ہو سکتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا نہ کوئی دوسرا انسان مکمل صادق اور امین ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ کہتے ہیں کہ دستور کی شق 63-62 کا ختم ہونا ضروری ہے۔ ایک سائل از لاہور)

جواب: میاں نواز شریف کے خلاف عدالتی فیصلے اور ان کی وزارتِ عظمیٰ سے معزولی کے بعد بالعموم کئی تصور یا رجحان سامنے آئے ہیں۔۔۔ پہلا رجحان تو یہی ہے جو سوال کی صورت میں مذکور ہوا۔ اس رجحان میں دو مغالطے کارفرما ہیں۔ ایک تو یہ کہ صادق اور امین صرف نبی ہی ہو سکتے ہیں، عام انسان اس وصف یا خوبی سے متصف نہیں ہو سکتے۔ دوسرا مغالطہ جو اسی سوچ کا منطقی نتیجہ ہے کہ دفعہ 63-62 کو ختم کر دیا جائے۔۔۔ یہ سوچ اور اس پر مبنی نتیجہ دونوں یکسر غلط ہیں۔

نبی بلاشبہ صادق اور امین ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ معصوم بھی ہوتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی

---

[1] آئین کے آرٹیکل باسٹھ اور تریسٹھ کیا ہیں؟ اس کی تفصیلی شقیں مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

مرحلے میں نبی سے امانت وصداقت سے ذرا سا بھی انحراف ہوتو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً متنبہ کردیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ان کی فی الفور اصلاح ہوجاتی ہے۔عام انسان اس تنبّہُ الٰہی سے بالعموم محروم ہوتے ہیں۔اس لیے ان کی معمولی فروگزاشتوں سے صرف نظر کرکے ان کے مجموعی کردار کوملحوظ رکھنے کا حکم ہے۔ بنابریں آئین کی 63-62 دفعات کے خاتمے کا رجحان نہایت خطرناک ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اسلام کے جس حکم پر بھی ہم عمل کرنا نہ چاہیں یا ہمیں اس پر عمل کرنا مشکل نظر آئے تو ہم یہ مطالبہ کریں کہ اس کو سرے سے ختم ہی کردیا جائے۔نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

زیر بحث دفعات اسلامی احکام پر مبنی ہیں اور اسلام کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے کہ انسانوں کے لیے ان پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾[البقرۃ:286]

''اللہ تعالیٰ کسی نفس کوایسی ذمہ داری کا حکم نہیں دیتا جواس کی طاقت سے بالا ہو''۔

ہاں اس کے تحمل اور ادائیگی میں مشقت ہوسکتی ہے۔لیکن دنیا کا کون سا کام ایسا ہے جس میں مشقت نہ ہو۔اگر اللہ کے حکم پر عمل کرنے میں مشقت ہوتو اس کو اس مشقت کی وجہ سے ناممکن العمل قرار دیا جاسکتا ہے؟نہیں ہرگز نہیں بلکہ جس طرح دنیا کا ہر کام، چاہے اس میں کتنی ہی مشقت ہو، کرتے ہیں بلکہ یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ جتنی زیادہ محنت اور مشقت ہوگی، اس کا صلہ اور نتیجہ بھی اچھا ملے گا اور فی الواقع ایسا ہی ہوتا ہے۔اِلا أن یشاء اللہ۔اسی طرح اللہ کے احکام پر عمل کرنے میں جتنی محنت ومشقت برداشت کی جائے گی یا لذات وخواہشات نفسانی کی جتنی زیادہ قربانی دی جائے گی، اللہ کے ہاں اس کا اجر وصلہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے:''إِنَّ عِظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلاءِ''[1]''آزمائش جتنی بڑی ہوگی، جزا بھی اتنی ہی بڑی ہوگی''۔بلکہ ایک اور حدیث میں ہے:''حُفَّتِ الجَنَّةُ بِالمَكَارِهِ، وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ''[2]۔''جنت کو ایسے کاموں سے ڈھانپ دیا گیا ہے جن کا کرنا نفس پر گراں ہے اور جہنم

[1] سنن الترمذی:باب ماجاء فی الصبر علی البلاء حدیث :2396، حسن صحیح

[2] سنن الترمذی : باب ماجاء حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات ۔حديث : 2559 قال الألبانی صحيح

کوشہوات (انسان کے مرغوب کاموں) سے ڈھانپ دیا گیا ہے''۔

(2) دوسرا رجحان یہ سامنے آیا ہے کہ 63-62 دفعات کا اطلاق صرف ممبران اسمبلی ہی کے لیے ضروری نہ ہو بلکہ تمام سرکاری اہل کاروں بالخصوص بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز افراد کے لیے بھی ضروری قرار دیا جائے۔ یہ تجویز بھی نہایت اہم اور ضروری ہے۔ ہر محکمے میں جس طرح کرپشن عام ہے اور جس کے پاس جتنا بڑا عہدہ ہے، وہ اتنا ہی کرپٹ ہے۔ افسران بالا کی کرپشن کی داستانیں آئے دن اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہے۔ اس کا حل یہی ہے کہ ان دفعات کے اطلاق کو وسیع کیا جائے اور سرکاری اہل کاروں بالخصوص افسران بالا کو اس شکنجے میں کسنے کا اہتمام کیا جائے:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

تیسرا تائثر یہ سامنے آیا ہے کہ جب مکمل طور پر اہل تر افراد میسر نہ ہوں تو کم تر اہلیت کے حامل افراد بھی قابل قبول ہوتے ہیں اور یہ ایسا اصول ہے کہ زمینی حقائق کی روشنی میں ہر معاشرے اور ہر شعبے میں اسے روبہ عمل دیکھا جا سکتا ہے، بلکہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں اور جب ایسا ہے تو صرف وزارتِ عظمٰی پر فائز شخص کے لئے اہلیت کا ایسا اعلیٰ معیار، ایک آئیڈیل کے طور پر تو صحیح ہے، لیکن اسے فرض و لازم سمجھنا ایک نامناسب رویہ ہے۔ زیر بحث فیصلے میں ایسے ہی نامناسب رویے کا پرتو نظر آتا ہے۔ انتخابات کے موقع پر کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال میں دفعہ 62، 63 سامنے ہوتی ہے، اس کے باوجود جن کو انتخاب لڑنے کا اہل قرار دیا جاتا ہے، کیا وہ واقعی مذکورہ دفعات کی روشنی میں انتخاب لڑنے کے اہل ہوتے ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو فیصلے کے بعد لوگوں کا یہ کہنا کہ تمام ممبران اسمبلی ان دفعات کی رُو سے نااہل ہیں، کیا حیثیت رکھتا ہے؟ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ ان کو اہل سمجھ کر انتخاب لڑنے کا موقع دیا گیا۔ دراں حالیکہ وہ اہل یا اہل تر نہیں تھے اور اسمبلیوں پر براجمان ہونے کے باوجود ان کی اہلیت، سوالیہ نشان ہے۔ پھر وزیر اعظم کے لئے ایسا کڑا معیار کیوں جس پر شاید ہی کوئی ممبر اسمبلی پورا اتر سکے؟

چوتھا تائثر یہ ہے کہ دراصل یہ الٰہی فیصلہ ہے، جس کو ٹالنے پر کوئی قادر نہیں ہے۔ اتنی چھان بین کے

باوجود عدالت کو اور مشترکہ تحقیقاتی ٹیم کو کوئی واضح چیز ایسی نہ مل سکی جس کو کرپشن قرار دیا جا سکے۔ اس کے باوجود عدالت نے نااہل قرار دے دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، جس کا اظہار اللہ نے ججوں کے ذریعے سے کروایا ہے۔ اس فیصلہ ءالٰہی میں خدا فراموشی کا یہ نتیجہ دکھائی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میاں صاحب کو متعدد مرتبہ موقع دیا لیکن انہوں ملک سے نے سود کا خاتمہ کرنے کی کوئی ادنیٰ سی بھی کوشش نہیں کی، عدالت نے فیصلہ بھی دے دیا لیکن اسے سرد خانے کی نذر کر دیا گیا۔ عدالت نے نفاذ اردو کا حکم دیا، اسے بھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی، حالانکہ یہ فیصلہ بھی ایسا تھا کہ 20 کروڑ عوام کو اس سے بے پناہ فائدے حاصل ہوتے۔ کرپشن ہر محکمے میں عام ہے، اس کے انسداد کی بھی کوئی صورت تجویز نہیں کی گئی، گویا یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بھی ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس متعدد ایسے مسائل ہیں، جن کا حل حکومتی سطح پر نہایت ضروری ہے۔ اس لئے اس رائے میں بھی بہت وزن ہے کہ یہ مؤاخذۂ الٰہی ہے جس کے لئے توبہ واستغفار اور آئندہ کے لئے تصحیح نیت ضروری ہے۔ پھر اللہ کا وعدہ ہے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ [محمد:7]

"اے ایمان والو اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا"۔ افسوس اس وعدۂ الٰہی پر نہ کوئی یقین کرتا ہے اور نہ اس کے لئے کوشش ہی کرتا ہے بلکہ اس کے برعکس ہر برسر اقتدار شخص یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے دین کی طرف کوئی قدم اٹھایا تو بین الاقوامی طاقتیں، جن کے شکنجے میں ہماری حکومتیں بری طرح جکڑی ہوئی ہیں، مجھے اقتدار پر فائز نہیں رہنے دیں گی، لیکن جس اللہ کے پاس تمام اختیارات ہیں، اس کی قوت وقہرمانی کو وہ فراموش کئے رکھتا ہے، اس کے مؤاخذہ کا کوئی خوف اسے محسوس نہیں ہوتا، بالآخر وہ اس کی گرفت میں آ کر ہی رہتا ہے۔

کاش میاں نواز شریف اب بھی اس نکتے کو سمجھ لیں اور ان کی اتحادی دینی جماعتیں بھی ان کی ذہنی تطہیر کی کوشش کریں تو شاید وہ آئندہ کو چہ ءاقتدار سے اس طرح بے آبرو ہو کر نہ نکلیں۔ اس کے لئے ان کا اور مسلم لیگ (ن) اور ان کی اتحادی جماعتوں کا اولیں قدم یہ ہونا چاہیے کہ وہ دفعات 62،63 کے خاتمے کا قطعاً مطالبہ نہ کریں۔ یہ دفعات نہایت ضروری ہیں۔ ان کے اطلاق میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ حالیہ

فیصلے میں بھی بعض حلقوں کا یہ تأثر ہے، لیکن بعض افراد کی غلطی سے، اگر وہ واقعی غلط اطلاق کا نتیجہ ہے، ان دفعات کے ختم کرنے کے مطالبے کا جواز نہیں بن سکتا۔ ان دفعات کی اہمیت، افادیت وضرورت، بلکہ ناگزیریت مسلّم ہے۔ ان کے خلاف آواز اٹھانا مسلم لیگ (ن) یا کسی بھی سیاسی فرد یا جماعت کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ مذہبی ذہن رکھنے والوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کی حمایت سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ اس سے قبل سیاست دانوں کو نااہل قرار دینے کے لئے بعض قوانین بنائے گئے تھے جیسے ایبڈو (الیکٹڈ باڈیز ڈس کوالیفکیشن آرڈر) مجریہ 1959ء اور پوڈو (پبلک آفس ڈس کوالیفکیشن آرڈیننس) مجریہ 1962ء، وغیرہ ان کا مقصد اہل سیاست کو سیاست سے بے دخل کرنا تھا۔ اس وقت کے اہل سیاست کرپشن کی ان صورتوں سے ناآشنا تھے جواب عام ہیں نہ سیاست سے ان کا مقصد دولت یا وسائل دولت کا حصول ہی تھا۔ اس وقت سیاست دولت لٹا کر قوم کی خدمت کرنے کے جذبہ کا نام تھا، لیکن اس وقت اقتدار پر فائز فوجی حکمران نے، غلط یا صحیح، اپنے طور پر یہ سوچا کہ میں ان کے اقتدار میں آنے کا راستہ بند کردوں، تاکہ میں یکسوئی سے ملک کو ترقی کی راہ پر ڈال سکوں۔

جس وقت 62، 63 دفعات کو دستور کا حصہ بنایا گیا، صورت حال یکسر تبدیل ہوچکی تھی، سیاست دان یا غیر سیاسی لوگ سب دولت کی ہوس کا شکار تھے اور کرپشن کی داستانیں عام تھیں، اس کے سدباب کے لئے مذکورہ دفعات نافذ کی گئیں جو فی الواقع اخلاص پر مبنی تھیں نہ کہ بدنیتی پر۔ اب کرپشن کی صورت حال پہلے سے کہیں زیادہ خراب ہے، اس لئے یہ دفعات نہایت ضروری ہیں، تاکہ کرپٹ لوگ سیاست میں نہ آسکیں اور اگر آجائیں تو ان کا محاسبہ کیا جاسکے۔

آخر میں اس تأثر کو زائل اور ختم کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ صادق اور امین محض انبیاء ہی ہوتے ہیں۔ آج کل میڈیا کے تمام چینلز سیاسی اور عوامی پلیٹ فارموں پر اس کی اتنی ترویج کی جارہی ہے جس سے محسوس ہوتا ہے یہ ذہن سازی کا مرحلہ ہے اور اگلے مرحلے میں آرٹیکل کے شق 62، 63 کو آئین سے نکال باہر کیا جائے گا۔ ملک کے نامور صحافی حامد میر نے تو ایک ٹی وی پروگرام میں یہاں تک کہہ دیا کہ 62، 63 یہ

فرشتوں کیلئے بنایا گیا ہے، ملک کی حزب اختلاف کی ایک بہت بڑی جماعت تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان نے بھی چند برس قبل ایک برطانوی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے یہی الفاظ استعمال کئے تھے کہ 62،63 کا قانون فرشتوں کیلئے بنایا گیا ہے۔ اور سپریم کورٹ کے ایک فاضل جج نے ریمارکس دئے کہ آرٹیکل 62،63 لگایا تو پارلیمنٹ میں سراج الحق کے سوا کوئی نہیں بچے گا۔ اور بعض دیگر حضرات کا خیال بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ مذکورہ آرٹیکل پر محض انبیاء اور وہ گوشہ نشیں افراد پورے اتر سکتے ہیں جو دنیا سے کٹ کر اللہ کی خاطر خلوت اختیار کر چکے ہیں۔ لہذا اس تاثر کو ختم کرنا دعاۃ ومبلغین اور اہل قلم حضرات کی ذمہ داری ہے کہ صداقت وامانت محض انبیاء، فرشتوں اور صالحین کا کام نہیں بلکہ ہر ذمہ دار اور ہر مسلم سے یہ مطلوب ومقصود ہے۔ اور یہ تاثر بھی کہ صادق اور امین لوگ ملنا مشکل ہیں غلط اور سراسر بد دیانتی پر مبنی ہے۔ عصر حاضر میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو صدق وامانت کے پیکر ہیں۔ اور گذشتہ دور میں محدثین کی سیرت کا مطالعہ کیجئے معلوم ہوگا کہ صداقت اور امانت کیا چیز ہوتی ہے اور وہ ہمارے جیسا ہی انسان ہوتے ہوئے کس طرح اس وصف پر کماحقہ پورے اترے۔ اور رجال کو جانچنے کیلئے ایسے اعلیٰ پیمانے وضع کر گئے کہ کسی کو بھی اس پر پرکھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ تصور سراسر قرآن وحدیث کی تعلیمات کے منافی ہے کہ صادق امین محض انبیاء یا اصفیاء واتقیاء کا طبقہ ہی ہوسکتا ہے دیگر مسلمانوں کے ذمہ داران کا اس وصف پر پورا اترنا ضروری نہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ سچائی امانت ودیانت کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور خائن وکذابین کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قول وفعل میں صدق وامانت کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے انہ ولی التوفیق۔

آئین کے آرٹیکل باسٹھ اور تریسٹھ کیا ہیں؟ کون ان پر پورا اترتا ہے؟

آئین کا آرٹیکل باسٹھ کہتا ہے:

1. کوئی ایسا شخص پارلیمنٹ کا رکن رہنے کا اہل نہیں جو پاکستان کا شہری نہ ہو۔
2. ضروری ہے کہ رکن پارلیمنٹ اچھے کردار کا مالک ہو۔

3 اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم رکھتا ہو۔

4 اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند ہو۔

5 اس نے کبھی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب نہ کیا ہو۔

6 رکن پارلیمنٹ سمجھدار، پارسا، ایماندار، صادق اور امین ہو۔

7 عیاش، فضول خرچ اور آوارہ گرد نہ ہو۔

8 کسی اخلاقی پستی میں ملوث یا جھوٹی گواہی پر سزا یافتہ نہ ہو۔

آئین کا ارٹیکل تریسٹھ کہتا ہے:

1 اگر کوئی شخص فاتر العقل ہو یا کسی مجاز عدالت نے اسے ایسا قرار دیا ہو تو وہ پارلیمنٹ کا رکن نہیں رہ سکتا۔

2 نظریۂ پاکستان اور ملکی سالمیت کیخلاف رائے رکھنے والا شخص بھی رکن پارلیمنٹ رہنے کا اہل نہیں۔

3 مسلح افواج اور عدلیہ کی تضحیک کرنے والا شخص بھی آرٹیکل تریسٹھ کے دائرے میں آئے گا۔

4 نا اہلی کے زمرے میں آنیوالے رکن کیخلاف سپیکر یا چیئرمین سینیٹ معاملہ الیکشن کمیشن کو ریفر کرے گا جو نوے دن میں فیصلہ کرے گا۔

مذکورہ دفعات کی مخالفت کرنے والوں سے سوال

بتلایا جائے ان دفعات میں سے کونسی دفعہ ایسی ہے جو غیر ضروری ہے؟

یا جس پر عمل کرنا ناممکن ہو؟

یا ایک مسلمان اور پاکستانی کے لیے اس سے متصف ہونا ضروری نہیں ہے؟

بالخصوص حکمرانوں اور عوام کے نمائندوں کے لیے، جن کے لیے ضروری ہے کہ ان کا کردار ایسا مثالی ہو کہ کوئی ان پر انگلی نہ اٹھا سکے۔

اسی لیے تو کہا گیا ہے ۔

سبق پڑھ پھر عدالت کا شجاعت کا صداقت کا
لیا جائے گا کام تجھ سے دنیا کی امانت کا

انتہا پسندی

کے انسداد میں سلفی عقائد کا کردار[1]

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی حفظہ اللہ[2]

سوویت یونین کے زوال اور امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کے بعد اقوامِ عالم کے مابین ٹکراؤ کی نوعیت تبدیل ہوگئی ہے۔ گذشتہ صدی کا بیشتر حصہ مغربی اقوام کے مابین اختلافات اور جنگوں کی نذر ہوا جنگِ عظیم اوّل، دوم اور پھر سرد جنگ۔ جبکہ 1990ء کے بعد سے اسلام و مسلمان اور مغرب کے مابین براہِ راست مسلح کشمکش جاری ہے۔ جنگِ خلیج، عراق کی پہلی، دوسری جنگ اور افغانستان میں یہی صورتحال ایک عشرے سے زیادہ عرصہ تک رہی۔ اور اس کے بعد دشمن نے اپنے ممالک میں بیٹھ کر بلادِ اسلامیہ میں باہمی تصادم اور خانہ جنگی کو فروغ دیا۔ اس عرصہ کے دوران ہونے والے تشدد و مظالم کا نتیجہ مسلم نوجوانوں کے افکار و نظریات میں بھی ظاہر ہونا شروع ہوگیا اور آج 25 برس بعد مسلم دنیا کا اہم ترین مسئلہ 'تشدد اور انتہا پسندانہ نظریات کا فروغ' بن چکا ہے۔ جس کو ملکی اور عالمی سطح پر بہ کثرت زیر بحث لایا جا رہا ہے۔

عالم کفر کے مظالم، تشدد اور ریشہ دوانیاں اپنی جگہ قابل مذمت ہیں اور ان کا بہر طور مداوا ہونا چاہیے، ظلم کو کسی صورت بھی جاری نہیں رہنا چاہیے، تاہم افکار و نظریات میں انتہا پسندی معاشرے کے رخ کو بدل دیتی ہے، اس کے صالح اور مفید پہلو کو دبا دیتی ہے۔ اس لیے اسلام کے اصل اور معتدل نظریات کو واضح اور

---

[1] یہ مضمون ماہنامہ محدث (لاہور) کے مدیر اعلیٰ محترم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ کی خصوصی اجازت سے البیان میں شائع کیا جا رہا ہے۔

[2] مدیر ماہنامہ محدث (لاہور)

نمایاں رہنا چاہیے۔ افراد کے مسائل ہوں یا معاشرے کے، کوئی بھی شدت اور انتہا پسندی سے حل نہیں ہوتے، بلکہ مزید بگڑ جاتے ہیں۔ جس کا نقشہ ہم امریکہ اور بھارت کی حالیہ انتہا پسندانہ قیادتوں ڈونلڈ ٹرمپ اور نریندر مودی کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ بظاہر اس انتہا پسندی سے بعض پہلوؤں میں پیش قدمی ہو بھی جائے لیکن افراد و معاشرے غلط طرزِ عمل کے عادی ہو کر آخر کار ٹکراؤ اور تخریب کی طرف چل نکلتے ہیں، جس کا نتیجہ بنی نوع انسان کی تباہی و بربادی کی صورت میں ہی نکلتا ہے۔

اسلام اپنی خالص صورت میں کتاب وسنت میں محفوظ ہے، اور ہر دور کے مسلمان اپنے فکر وعمل کی اصلاح کے لیے اسی چشمہ صافی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہر دور کے بدلتے حالات سے پڑنے والی گرد، قرآن وسنت کے براہِ راست مطالعے سے صاف ہوجاتی ہے اور اسلام کا پیغام اصل سرچشموں سے واضح ہوتا رہتا ہے۔ مسلمانوں میں وہ لوگ جو کتاب وسنت سے خالص تمسّک اور پابندی اختیار کرتے ہیں، سَلَف اور اس نظریہ کے حامل 'سلفی' کہلاتے ہیں۔ سلفیہ کے دیگر ناموں میں اہل حدیث، اہل السنّہ، اہل اثر اور اہل اتباع بھی ہیں اور انہی کو طائفہ منصورہ، فرقہ ناجیہ، انصار السنّہ بھی کہا جاتا ہے۔ واضح ہے کہ اعمال کے پس پردہ اصل طاقت عقائد ونظریات کی ہوتی ہے۔ زیر نظر مضمون میں ہم دیکھتے ہیں کہ سلفی عقائد میں انتہا پسندی کی کوئی گنجائش ہے؟ اور صدیوں سے چلے آنے والے مسلّمہ سلفی عقائد کس طرح اُمّتِ مسلمہ کو توازن واعتدال کا درس دیتے ہیں۔

'سلفیت' سے کیا مراد ہے؟

سلف کا لفظ تاریخی طور پر ان تین طبقات: صحابہ کرام، تابعین عظام اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے لیے بولا جاتا ہے جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطورِ خاص 'اُمّت میں سے بہترین' ہونے کی خوش خبری دی ہے۔ سیدنا عمران بن حصین سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''خَيْرُكُمْ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ- قَالَ عِمْرَانُ: لاَ أَدْرِي أَذَكَرَ النَّبِيُّ ﷺ بَعْدُ قَرْنَيْنِ أَوْ ثَلاَثَةً - قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: 'إِنَّ بَعْدَكُمْ قَوْمًا يَخُونُونَ وَلاَ يُؤْتَمَنُونَ،

وَيَشْهَدُونَ وَلاَ يُسْتَشْهَدُونَ وَيَنْذِرُونَ وَلاَ يفُونَ، وَيَظْهَرُ فِيهِمُ السَّمَنُ''۔[1]

''تم میں سب سے بہتر میرے زمانہ کے لوگ (صحابہ) ہیں۔ پھر وہ لوگ جو اُن کے بعد آئیں گے (تابعین)، پھر وہ لوگ جو اس کے بھی بعد آئیں گے (تبع تابعین)''۔عمران نے بیان کیا کہ میں نہیں جانتا، حضور ﷺ نے دو زمانوں کا (اپنے بعد) ذکر فرمایا یا تین کا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ''تمہارے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو خائن ہوں گے، جن میں دیانت کا نام نہ ہوگا۔ ان سے گواہی دینے کے لیے نہیں کہا جائے گا، لیکن وہ گواہیاں دیتے پھریں گے۔ نذریں مانیں گے لیکن پوری نہیں کریں گے۔ موٹاپا اُن میں عام ہوگا۔''

'سلفی منہج' ان عقائد کو اختیار کرنے کا نام ہے جس پر فرقوں اور اَحزاب سے علیحدہ رہتے ہوئے اس اُمت کے نمایاں اسلافِ کرام کاربند رہے، چاہے وہ اللہ تعالیٰ، انسان اور کائنات وزندگی کے بارے میں اساسی عقائد ہوں، یا فہم اسلام کے حوالے سے فکری مباحث ہوں یا ایسے اسلامی اوصاف ہوں جن سے متصف ہوتے ہوئے ان ائمہ کرام نے اُنہیں اختیار کیا۔ چنانچہ سلفی دعوت کی تعریف یوں ہے:

''الدعوة إلى الكتاب والسنة وما كان عليه السلف الصالح من الصحابة الكرام رضوان الله عليهم والتابعين لهم بإحسان وأتباعهم وأئمة الدين ممن شُهد لهم بالإمامة في الدين، وتلقى الناس كلامهم خلفًا عن سلف''۔[2]

''کتاب وسنّت اور اس منہج کی دعوت دینا جس پر صحابہ وتابعین، تبع تابعین اور ایسے ائمہ دین کاربند رہے جن کی امامت وقیادت دین میں مسلّمہ ہے، اور مسلمانوں نے اپنا دین اُن سے حاصل کیا ہے۔''

الغرض سلف سے اصلاً مراد تو صحابہ وتابعین ہیں اور پھر وہ ائمہ اسلاف جو اُن کے نقش قدم پر چلے: جیسے

[1] صحیح بخاری، کتاب الشہادات، باب لا یَشهد على شهادة جور: 2651

[2] الموسوعة الميسرة في الأديان والمذاهب المعاصرة: 2/1082، فتاوٰی اللجنة الدائمة: 12/241، بحواله السلفية حقيقتها وأصولها وموقفها من التكفير از ڈاکٹر سلیمان عبد الله ابا الخيل، رکن هيئة كبار علما، سعودی عرب اور وائس چانسلر امام یونیورسٹی، ریاض: ص 40 طبع اوّل، دارالعاصمہ 2015ء

امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام سفیان ثوری، امام ابن عیینہ، حماد بن سلمہ، حماد بن زید، امام بخاری، امام مسلم، اور سنن اربعہ کے مؤلف محدثین، اور وہ جلیل القدر ائمہ کرام رحمہم اللہ جن کے علم وفضل اور زہد وورع کی بنا پر اُنہیں درجہ امامت حاصل ہوا، اور اُمت نے اُن کو قبول عام بخشا۔ پھر جن لوگوں نے ان صحابہ کرام اور ائمہ اسلاف جیسا فکری وعملی رویہ اختیار کیا، وہ سلفی کہلائے۔ اور انہی کو 'اہل السنہ والجماعۃ' اور 'اہل الحدیث والسنّہ' بھی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''الصحابة -رضي الله عنهم- ومن سلك نهجهم من خيار التابعين رحمة الله عليهم، ثم أصحاب الحديث ومن تبعهم من الفقهاء جيلا فجيلا إلى يومنا هذا،ومن اقتدى بهم من العوام في شرق الأرض وغربها رحمة الله عليهم''۔[1]

''صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور بہترین تابعین جو اُن کے منہج پر چلے، پھر وہ اصحابِ حدیث اور ہر دور میں ان کے منہج کو اختیار کرنے والے فقہائے کرام اور تاحال زمین کے شرق وغرب میں اُن کے نقش قدم پر چلنے والے پیروکار، یہ سب اہل السنہ والجماعہ ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم''

1. چنانچہ سلفیت میں کسی زمانے کی تحدید نہیں بلکہ ہر دور میں جو مسلمان ائمہ کرام صحابہ اور تابعین کے مسلک ومنہج پر کاربند رہے، وہ سلف کے منہج کو اختیار کرنے والے سلفی ہیں۔

2. سلف میں وہ گمراہ فرقے اور ان کی طرف بلانے والے اشخاص شامل نہیں جنہوں نے سنّتِ نبوی اور صحابہ کرام کے مجموعی طرزِ فکر وعمل کی مخالفت کی، مثلاً رافضی، خارجی، قدری، جبری، معتزلہ، جہمی اور مشبّہہ ومعطّلہ وغیرہ۔

3. سلفیت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ایسے عقائد کی طرف بلایا جائے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے اختیار نہیں کیا۔ نہ لوگوں کو ایسی آزمائش میں ڈالا جائے جس سے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے اُنہیں نکالا ہے۔

4. سلفیہ کا شرعی منہج یہ ہے کہ وہ مرادِ شارع پر عمل کرتے ہوئے ظاہر نص سے انحراف نہیں کرتے، کسی مسئلہ میں تمام نصوص کو جمع کر کے موقف کو اختیار کرتے اور نصوصِ شریعت کے مابین تعارض دور کر کے جامع مفہوم پر

---

[1] الفصل فی الملل والنحل از حافظ ابن حزم:2/ 113

عمل پیرا ہوتے ہیں۔ وہ محکم پر عمل کرتے اور متشابہ پر ایمان لاتے ہیں، اور متشابہ نصوص کو محکم پر پیش کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی تفسیر قرآن، سنت، صحابہ کرام اور عربی لغت سے کرتے ہیں اور مجرّد ذاتی رائے پر ہونے والی تفسیر کو نظر انداز کرتے ہیں۔ سلفیہ کا انحصار و میزان کتاب وسنت ہے۔ عقائد میں خبر واحد کو قبول کرنا سلف صالحین کا منہاج ہے اور کتاب وسنت پر اکتفا کرتے ہوئے علم کلام وفلسفہ میں زیادہ نہ اُلجھنا سلف کا شعار ہے۔ اور اپنے مقابل موقف والوں پر طعن وتشنیع سے بچنا، اور عدل وانصاف پر کاربند رہنا اُن کی مسلّمہ روایت ہے۔

5 یہ بھی سلفیت نہیں ہے کہ جو آیات واحادیث قرآنی معانی کو متعین کرتی ہیں، ان کو نظر انداز کر کے من مانی تعبیر کی جائے۔ اور لغتِ عرب اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ اجمعین کی تفسیرات سے بالا ہی قرآن کریم کی فاسد تاویلات اختیار کر لی جائیں۔ قرآن وسنت کو باہم ٹکرا کر، بعض دلائل کو اختیار اور بعض کو ترک کر دیا جائے۔ یا صرف متفقہ اُمور کو اختیار کیا جائے اور احتمالی نصوص کو ترک یا اُن کی تاویل کر لی جائے۔ یا نصوصِ شریعت کی من مانی اور ذاتی رجحانات کے مطابق تعبیر وتوجیہ اختیار کی جائے۔

6 مسلمانوں کو آپس میں اختلاف اور فرقہ واریت کی دعوت نہ دینا 'سلفیت' ہے۔ ان میں کسی ایک امام فقیہ کو اپنی اتباع کے لیے متعین کر لینا اور اُس کے نام پر فرقے قائم کر لینا بھی سلفیت نہیں۔ چنانچہ سلفیہ کا موقف ہے کہ ہر فقیہ وامام کا قول لیا اور ترک کیا جا سکتا ہے، سوائے امام امّتِ محمدیہ، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو خواہش نفس کی بجائے صرف وحی کی بنا پر ہی بولتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر بات ہی قابل اتباع ہے۔ گویا کسی خاص فقہی مکتبِ فکر یا فقہی شخصیات کی طرف ہی منسوب ہو جانا، اور ان کے اقوال کو شرعی نص کا درجہ دے دینا، اور اس بنا پر کتاب وسنت کے نصوص کو نظر انداز کر دینا سلفیت نہیں ہے۔ چنانچہ اہل السنہ اور اہل الحدیث کے امام وقائد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور سلفیہ تمام اہل علم کے اقوال کو نبی مکرّم کے اقوال پر پیش کر کے صرف اُسی کی اتباع کرتے ہیں۔[1]

7 سلفیہ، نصوص شریعت میں سلَف کا اجماعی مفہوم لیتے ہیں۔ اگر کسی جگہ سلف میں اختلاف ہے، تو

---

[1] السلفية حقيقتها وأصولها از ڈاکٹر سلیمان عبد اللہ ابا الخیل: ص 53

غور کر کے ’’اقرب الی الکتاب والسنہ‘‘ پر عمل کرتے ہیں۔

8 مسلمانوں کے قابل احترام اور مسلّمہ ائمہ کرام کے بارے میں غیر محتاط انداز اور زبان بولنا اور اُن ائمہ سے یہ کہہ کر مستغنی ہونا بھی سلفیت نہیں کہ ’’ہمارے لیے صرف قرآن وسنت کافی ہیں اور ہمیں کسی مفسر ومحدث اور فقیہ کی ضرورت نہیں‘‘[1] ہے۔ بلکہ تفسیر وحدیث اور فقہ میں صحابہ کرام اور ائمہ اسلاف نے جو عظیم خدمات انجام دی ہیں: روایت واسماء الرجال، احادیث کی صحّت وضعف، ترجیح وتطبیق، توحید اور اس کی اقسام، غیبی اُمور، عقائد ماقبل وبعد الموت، نسخ، تخصیص، اطلاق، اجماع وقیاس کے باب میں اُن کی خدمات سے استفادہ کرنا ضروری ہے، تاہم میزان کا درجہ صرف قرآن وسنت کو حاصل ہے۔ ائمہ اسلاف کو شریعت کی وضاحت میں اتنی حیثیت دینی چاہیے اور یہ ملتِ اسلامیہ میں اتحاد کا اچھا طریقہ ہے۔

سلفیت یہی ہے جس کا تذکرہ مذکورہ بالا سطور میں کیا گیا۔ اور بعض کتب مثلاً ’’تاریخ مذاہب اسلامیہ‘‘ از محمد ابوزہرہ، ’’تاریخ دولتِ عثمانیہ‘‘ از محمد فرید بک، ’’فکر اسلامی کا ارتقا‘‘ از محمد بہی، ’’رحلہ حجازیہ‘‘ از محمد لبیب بتنونی، اور حاشیہ جلالین وحاشیہ ابن عابدین وغیرہ میں سلفیت اور اس کے حاملین پر جو الزامات لگائے گئے ہیں، سلفیت ان سے بریٔ الذمہ ہے۔ ایسے ہی بعض جماعتیں مثلاً الاخوان لمسلمون، حزب التحریر اور تبلیغی جماعت ’وہابیت‘ کے نام سے جس طرح سلفیت کی تضحیک وتحقیر کرتی ہیں، یہ بھی درست نہیں اور قابل اصلاح رویہ ہے کیونکہ سمع وطاعت، تکفیر وخروج اور جہاد ودعوت کے میدان میں سلفیوں نے ان جماعتوں کے ایسے نقطہ نظر کی اصلاح کی جس میں یہ اہل السنۃ والجماعۃ کے مناہج پر کاربند نہیں رہ سکے۔

علاوہ ازیں فی زمانہ بہت سی جماعتوں اور تحریکوں نے اپنے تئیں اپنے آپ کو سلفیت کا علم بردار قرار دیا ہے، حالانکہ یہ حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہے۔ چنانچہ ’القاعدہ‘ اور دنیا بھر میں اس کی شاخیں، ’داعش‘ اور اس

---

[1] جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، صحیح بخاری میں ہر مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن وحدیث کے دلائل کے ساتھ ائمہ لغت اور ائمہ مفسرین ومحدثین کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں۔ نہ تو اُنہیں معصوم ومیزان سمجھتے ہیں اور نہ ان کی علمی کاوشوں اور وضاحتوں سے مستغنی ہوتے ہیں۔ اور یہی رویہ محدثین کے منہج پر چلنے والے ہر سلفی کا ہونا چاہیے۔

کی شاخیں، مصر کی الجماعۃ الاسلامیۃ اور تنظیم الجہاد الاسلامی، جزائر کی الجماعۃ المسلحۃ اور الجماعۃ السلفیۃ للدعوۃ والقتال، ایران کی سنّی جماعت 'جند اللہ'، صومال کی 'شباب المجاہدین'، لیبیا کی 'جماعتِ لیبیا' وغیرہ سلفی مناہج پر کاربند نہیں ہیں۔ فی زمانہ سلفیت کی پہچان کا اُصول یہ ہے کہ ہر وہ جماعت جو مسلمانوں کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے کی داعی ہو، اور کبیرہ گناہ کی بنا پر کافر قرار دیتی ہو، وہ سلفیت سے خارج ہے۔

محدثِ زماں شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ سے 'سلفیت' اور اس نام کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

''سلف کا کلمہ نبی کریم ﷺ نے خود استعمال فرمایا ہے، چنانچہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہ کو کہا: ''فاتقي الله واصبري ونعم السلف أنا لك''[1] ''اللہ سے ڈر اور صبر کر، اور میں تیرا بہترین سلَف (پیشرو) ہوں۔''... اور یہ کلمہ سلف علمائے اسلام کے ہاں بے پناہ استعمال ہوا ہے، جس کی ایک مثال ہی کافی ہے کہ بدعات کی تردید کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

وكل خير في اتباع السلف   وكل شر في ابتداع من خلف

''سلف کی پیروی میں ہی ہر قسم کی بھلائی ہے اور بعد میں آنے والوں کی بدعات میں ساری خرابیاں ہیں۔'' چنانچہ جو شخص سلفیت کا منکر ہے، گویا کہ وہ شخص اس صحیح اسلام سے براءت کا اظہار کرتا ہے جس پر ہمارے سلف صالح اور ان کے سرخیل محمد ﷺ کاربند تھے، چنانچہ صحیحین میں یہ متواتر حدیث موجود ہے کہ ''خَيْرُكُمْ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ''[2]

واضح رہے کہ سعودی عرب (اور اس کے بالتبع خلیجی ممالک کی اکثریت) بھی باضابطہ طور پر سلفیت پر ہی کاربند ہے اور یہی شرعی منہج سعودی عرب کے دستور اور سرکاری جامعات میں اختیار کیا گیا ہے۔ بعض لوگ جو سعودی عرب کو حنبلی مسلک پر کاربند اور حنبلی فقہ کا مقلد قرار دیتے ہیں تو ان کا یہ دعویٰ حقائق کے منافی ہے۔ دراصل اس طرح حنفیت پر کاربند مقلدین اپنے تقلیدی رجحان کا سعودی عرب میں فروغ دکھانا چاہتے

---

[1] صحیح مسلم: 6447

[2] مجلہ 'الاصالۃ' الجزائر... شمارہ 9: ص 86

ہیں۔ جبکہ سعودی عرب کے سرکاری ادارے، کبار علما کونسل، دار الافتا، عدالتیں اور قانونی دستاویزات، خطابات اور جامعات میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی۔ ان سرکاری اداروں کی طرف سے شائع ہونے والی کتب میں بھی صرف کتاب وسنت کو ہی میزان قرار دیا جاتا اور جملہ علمائے اسلاف (محدثین وفقہا) کی تعلیمات سے کھلا استفادہ کیا جاتا ہے۔ حرمین شریفین اور حج وعمرہ کے موقع پر سرکاری مطبوعات اور فتاویٰ وارشاد کے ادارے اسی کتاب وسنت کے سلفی منہاج کی پیروی کرتے ہیں۔ سعودی عرب کے مفتیانِ کرام سے جب کسی متعین امام کی فقہی تقلید کے بارے میں دریافت کیا جاتا ہے، تو ان کا جواب اس صورت حال کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے، چنانچہ مدینہ یونیورسٹی کے استاذ، محدث مدینہ شیخ عبدالمحسن عباد حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''وعلى هذا فهم لم يتخلّوا عن المذهب الحنبلي ولكنهم تخلوا عن التعصب له. وإذا وجد الدليل الصحيح على خلاف المذهب صاروا إلى ما دل عليه الدليل''۔[1]

''علمائے نجد نے حنبلی مذہب کو نہیں، اس کے لیے تعصّب کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ اور جب صحیح دلیل مذہب حنبلی کے خلاف ہو تو وہ دلیل پر عمل کرتے ہیں۔''

---

[1] مجلہ 'الفرقان' کویت، شمارہ جولائی 2000ء

سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا تو جواب دیا: "مذهبي في الفقه هو مذهب الإمام أحمد بن حنبل وليس على سبيل التقليد ولكن على سبيل الاتباع... أما في مسائل الخلاف فمنهجي فيها هو ترجيح ما يقتضي الدليل ترجيحه، والفتوى بذلك سواء وافق مذهب الحنابلة أم خالفه، لأن الحق أحق بالاتباع." (فتاوی المرأة المسلمة 14/1) ''فقہ میں میرا مذہب امام احمد بن حنبل کا مذہب ہے، بر سبیل تقلید نہیں بلکہ بر سبیل اتباع... اور اختلافی مسائل میں میرا طریق یہ ہے کہ میں دلیل کے مطابق ترجیح دیتا ہوں اور اسی طرح فتوی صادر کرتا ہوں، خواہ دلیل حنبلی مذہب کے موافق ہو یا مخالف کیونکہ حق ہی پیروی کا زیادہ حق دار ہے۔''

شیخ ابن باز مزید فرماتے ہیں: "فإذا كان من خالف السنة لقول أبي بكر وعمر تخشى عليه العقوبة فكيف بحال من خالفها لقول من دونهما او لمجرد رأيه واجتهاد " (مجموع وفتاوی ومقالات: ص99) ''اگر ابوبکر وعمر کے قول کی بنا پر، سنت کی مخالفت کی وجہ سے عذاب نازل ہونے کا اندیشہ ہوسکتا ہے تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جو ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے کمتر کسی اور قول یا اس کے مذہب یا اس کے اجتہاد کی بنا پر سنت نبویہ کی مخالفت کرتا ہو۔'' (بقیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

الغرض اسلام میں انتہا پسندی کی کوئی گنجائش نہیں، اسلام کا مزاج اعتدال وتوازن اور توسط و وَسطیّت پر مبنی ہے، اور سلفی جو برصغیر میں اہل حدیث کے نام سے معروف ہیں، اور خالص کتاب وسنت پر مبنی اسلام کے داعی ہیں، ان کے عقائد ونظریات میں بھی شدت وتشدد کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ چیز ان کے عقائد سے بھی واضح ہوتی ہے، اور مختلف مسائل میں ان کے رجحانات بھی اسی کے غماز وعکاس ہیں۔ جیسا کہ یہاں پہلے توازن واعتدال کی شرعی حیثیت واضح کرنے کے بعد سلفی عقائد ومسائل میں اس کی عملی مثالیں پیش کی جائیں گی۔

انتہا پسندی اور میانہ روی (وسطیت)

فی زمانہ تشدد وانتہا پسندی کے رجحانات بہ کثرت پھیلتے جارہے ہیں، واضح رہنا چاہیے کہ سلفیت کا شعار وسطیت اور میانہ روی ہے، یعنی انتہا پسندی سے گریز اور توازن واعتدال کی دعوت اور یہی اسلام کی مسلمہ خصوصیت ہے۔ اسلام ایک معتدل ووسط، میانہ رو دین ہے جس میں غلو، شدت وتشدد، سختی، خشکی، افراط وتفریط کا شائبہ تک نہیں۔ اس توازن واعتدال کو وَسَط کی شرعی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

1. مشہور ماہر لغت ابن فارس (م 395ھ) وسط کا لغوی مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”الواو والسين والطاء يدل على العدل، والنصف وأعدل الشيء أوسطه ووسطه“[2]

(بقیہ حصہ) سعودی عرب کے ممتاز عالم ربانی ومفتی شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ کا موقف ملاحظہ فرمائیں جو سب سے زیادہ واضح ہے:

"ولاريب أن مذهب الإمام أبي حنيفة ومذهب الإمام أحمد ومذهب الإمام الشافعي ومذهب الإمام مالك وغيرهم من أهل العلم قابلة أن تكون خطأ وصوابا.. فإن كل أحد يؤخذ من قوله ويترك إلا رسول الله." (مجموع فتاوی ورسائل شیخ ابن عثیمین: 1/28) ”بلاشبہ امام ابوحنیفہ، امام احمد، امام شافعی، امام مالک وغیرہ کے مواقف میں غلطی اور درستی دونوں کا احتمال ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا قول لیا اور چھوڑا جاسکتا ہے، سوائے محمد ﷺ کے فرمان کے۔“

”حق ان چار مذاہب میں منحصر نہیں بلکہ حق کسی اور مذہب میں بھی ہوسکتا ہے اور انہی چاروں ائمہ کا کسی مسئلہ میں اتفاق پوری امت کا اجماع قرار نہیں پاسکتا۔ اور خود ان ائمہ کو اپنا مقام ومرتبہ معلوم تھا اور اُنہیں اس بات پر یقین تھا کہ ان کی اطاعت اسی مسئلہ میں ہوسکتی ہے جو سنت رسول کے موافق ہو، اسی لیے وہ اپنی تقلید سے منع کیا کرتے تھے، الا یہ کہ ان کا مذہب سنت کے موافق ہو۔“

(مزید تفصیل کے لیے: ”اہل حدیث اور علمائے حرمین کا اتفاق رائے“ از ڈاکٹر حافظ محمد اسحٰق زاہد: ص 40 تا 45)

[2] معجم مقاييس اللغة: كتاب الواو، باب ’الواو والسين‘: 6/108

''وسط عدل وانصاف کا مفہوم دیتا ہے۔سب سے متوازن چیز وہ ہے جو سب سے زیادہ عدل اور میانہ روی پر قائم ہو۔''

2 وَسْط سین پر جزم کے ساتھ 'درمیانی جگہ' کا مفہوم دیتا ہے، جبکہ وَسَط سین پر فتحہ کا مفہوم: 'بہترین، افضل، عدل پر قائم، دو انتہاؤں کے درمیان' کا ہے۔[1]

3 قرآن کریم میں وسط، وسطیٰ، اور اوسط کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جیسے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾(البقرۃ:143) ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین یا عدل پر قائم اُمت بنایا۔''

4 مولانا عبد الرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''امتِ وسَط سے مراد ایسا اشرف اور اعلیٰ گروہ ہے جو عدل وانصاف کی روش پر قائم ہو اور افراط وتفریط، غلو اور تخفیف سے پاک ہو اور دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو۔''

5 اور مولانا حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہیں:

''اوسط کے لغوی معنیٰ تو درمیان کے ہیں لیکن یہ بہتر اور افضل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے یعنی جس طرح تمہیں بہتر قبلہ عطا کیا گیا، اسی طرح تمہیں سب سے افضل امت بھی بنایا گیا اور مقصد اس کا یہ ہے کہ تم لوگوں پر گواہی دو۔''

6 اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری میں مروی ہے کہ روزِ قیامت سیدنا نوح علیہ السلام کو بلا کر ان سے پیام رسالت پہنچانے کے بارے میں پوچھا جائے گا، وہ اثبات میں جواب دیں گے، لیکن ان کی قوم اس دعوت کے پہنچنے کا انکار کردے گی، پھر اللہ تعالیٰ سیدنا نوح علیہ السلام سے گواہ لانے کا مطالبہ کریں گے:

فيقول: "محمد وأمته، فيشهدون أنه قد بلّغ﴿وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾فذلك

---

[1] الصحاح:3/1167،لسان العرب:7/430

قوله: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ:143)﴾ والوسط: العدل.[1]

''تو نوح علیہ السلام کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمّت میری گواہی دے گی کہ نوح علیہ السلام نے پیغام پہنچا دیا۔ اور قرآن میں ہے کہ ''رسول تم پر گواہی دیں گے۔'' یہ مراد ہے اس آیت سے کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں اُمتِ وسط بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہی دو اور رسول تم پر گواہ ہو۔'' اور وسَط کا مطلب عدل ہے۔''

7 احادیثِ مبارکہ میں وسَط کا لفظ متعدد بار آیا ہے، جہاں وسط سے مراد 'صراطِ مستقیم' ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث میں ہے:

''خَطَّ لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ خطًّا، ثُمَّ قَالَ: 'هَذَا سَبِيلُ اللّٰهِ'، ثُمَّ خَطَّ خُطُوطًا عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ، ثُمَّ قَالَ: 'هَذِهِ سُبُلٌ عَلَى كُلِّ سَبِيلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُو إِلَيْهِ' ثُمَّ قَرَأَ'': ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (الانعام: 153)﴾[2]

''ہم نبی کریم کے پاس تھے کہ آپ نے ایک لائن کھینچی، پھر فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں بائیں لائنیں کھینچیں اور کہا کہ یہ راستے ہیں، ہر راستے کے سر پر ایک شیطان بیٹھا اس کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی کہ ''میرا راستہ سیدھا راستہ ہے، اس کی اتباع کرو اور (دیگر) راستوں کے پیچھے مت چلو، وہ تمہیں اللہ کے راستے سے دور کر دیں گے۔''

8 اس حدیث میں متعدد لائنوں کے درمیان جس خط کو کھینچا گیا، وہ صراطِ مستقیم تھا جو درمیان میں تھا، اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس کے لیے الخطّ الأوسط کا لفظ استعمال[3] ہوا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری: کتاب التفسیر، باب وکذلك جعلناکم...: رقم 4487

[2] مسند احمد بن حنبل: رقم 4142، قال الارناؤط: اسناده حسن

[3] سنن ابن ماجه، کتاب السنة، باب اتباع سنة رسول الله ﷺ: رقم 11

یعنی صراطِ مستقیم افراط وتفریط اور شدت وتلیین کے مابین ایک راستہ ہے جس میں سراسر اعتدال ہے۔

9 اس کی مزید وضاحت سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث کرتی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”ضرب الله مثلا صراطًا مستقيمًا،وعلى كنفي الصراط سوران فيهما أبواب مفتحة،وعلى الأبواب ستور مرخاة،وعلى الصراط داع يدعو يقول :يا أيها الناس!اسلكوا الصراط جميعًا ولا تعرجوا،وداع يدعو على الصراط،فإذا أراد أحدكم فتح شيء من تلك الأبواب قال ويلك لا تفتحه فإنك إن تفتحه تلجه، فالصراط الإسلام والستور حدود الله، والأبواب المفتحة محارم الله، والداعي الذي على رأس الصراط كتاب الله، والداعي من فوقه واعظ الله يذكر في قلب كل مسلم“۔[1]

”اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی مثال بیان کی ہے جس کے دونوں طرف دیواریں اور ان میں کھلے دروازے ہیں۔ان پر پردے لٹکے ہوئے ہیں جبکہ اس راستے کے سرے پر ایک پکارنے والا ہے جو کہتا ہے کہ اس راستے پر آؤ، غلط راستوں کا انتخاب مت کرو۔اور ایک دوسرا داعی ہے جو راستے پر کھڑا پکار رہا ہے، جب کوئی ان دروزاوں سے پردہ ہٹانے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ روکتا ہے کہ خبردار! اس پر مت جاؤ، اگر اُن پر چلے تو گر جاؤ گے۔صراطِ مستقیم سے مراد اسلام ہے، پردے اللہ کی حدیں ہیں، کھلے دروازے اللہ کی حرام کردہ چیزیں رممنوع کام ہیں اور صراطِ مستقیم کے سرے پر پکارنے والی اللہ کی کتاب ہے۔اور دوسرے داعی سے مراد اللہ کی طرف سے ایک نصیحت کرنے والا (ضمیر) ہے جو ہر مسلمان کے دل کو یاددہانی کراتا رہتا ہے۔“

[1] مستدرک حاکم: کتاب الایمان :1/ 145،رقم245،وقال : صحيح على شرط مسلم، ووافقه الذهبی اور شیخ شعیب ارناؤط نے مسند احمد میں اسے حسن کہا ہے۔(4/183)

⑩ 'اسلام' صراطِ مستقیم ہے، جیسا کہ سورۃ فاتحہ میں صراطِ مستقیم کو مغضوب علیہم: یہود اور ضالین: نصارٰی دونوں سے جدا قرار دے کر متوسط و معتدل راستہ قرار دیا گیا ہے۔

⑪ اسلام ہر مقام پر توسط و اعتدال کا داعی ہے، چنانچہ برکت بھی کھانے کے وسط میں اُترتی ہے۔ امام کو اپنے درمیان میں کرنا چاہیے۔ جنت کا سب سے اعلیٰ درجہ فردوس ہے جو اَوسط الجنّۃ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جھگڑا چھوڑنے والے کو وسطِ جنت میں گھر کی بشارت دی۔ اور زکوٰۃ میں درمیانہ مال ہی لینا چاہیے۔

⑫ اسلامی عقائد کا جوہر بھی وسطیت یعنی عدل و توسط ہے، امام حسن بصری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"دين الله وُضع فوق التقصير ودون الغلوّ"[1]

''اللہ کا دین، نقص و کمی سے اونچا اور شدت و انتہا سے نیچے بنایا گیا ہے۔''

⑬ نامور تابعی فقیہ، امام عامر شعبی رحمہ اللہ (م 100ھ) لکھتے ہیں:

"أحب أهل بيت نبيك ولا تكن رافضيا، واعمل بالقرآن ولا تكن حروريا، واعلم أن ما أصابك من سيئة فمن نفسك ولا تكن قدريا، وأطع الإمام وإن كان عبدًا حبشيا ولا تكن خارجيا،وقِف عند الشبهات ولا تكن مرجيا، وأحب صالح بني هاشم ولا تكن خشبيا، وأحب من رأيته يعمل الخير وإن كان أخرم سنديا"۔[2]

''اپنے نبی ﷺ کے اہل بیت سے محبت کر اور رافضی مت بن، قرآن پر عمل کر اور حروری نہ ہو جا، اور جان لے کہ جو بھی تجھے مشکل آتی ہے تو تیرے اپنے عمل کی بنا پر ہے، اور 'قدری' نہ بن۔ حاکم کی اطاعت کر اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، اور خارجی مت بن۔ شکوک وشبہات کو چھوڑ دے اور مرجئ نہ ہو جا۔ بنو ہاشم میں سے نیک افراد سے محبت کر اور خشبی (وہ غالی رافضی جو امام معصوم کے بغیر لڑنے کے قائل نہیں) نہ ہو جا۔ اور ہر نیکو کار سے محبت کر، اگرچہ وہ ناقص اور عیب دار ہی کیوں نہ ہو۔''

---

[1] الاعتصام از امام شاطبی: 1/245

[2] تہذیب تاریخ دمشق: 7/147

14 شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فإن الفرقة الناجية أهل السنة والجماعة يؤمنون بذلك، كما يؤمنون بما أخبر الله به في كتابه من غير تحريف ولا تعطيل، ومن غير تكييف ولا تمثيل، بل هم الوسط في فرق الأمة، كما أن الأمة هي الوسط في الأمم فهم وسط في باب صفات الله تعالى بين أهل التعطيل الجهمية وأهل التمثيل المشبهة. وهم وسط في باب أفعال الله بين الجبرية والقدرية وغيرهم، وفي باب وعيد الله بين المرجئة والوعيدية من القدرية وغيرهم، وفي باب أسماء الإيمان والدين بين الحرورية والمعتزلة وفي أصحاب رسول الله ﷺ بين الرافضة والخوارج"۔[1]

"فرقہ ناجیہ اہل السنۃ والجماعہ اِن باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، جس طرح وہ ہر اس بات پر ایمان رکھتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے، بلا کسی تحریف وتعطیل اور کیفیت وتمثیل کے بلکہ وہ اُمت کے گروہوں میں وَسَط ہیں جیسا کہ یہ امت محمدیہ دیگر امتوں کی وسط ہے۔ اہل السنۃ اللہ کی صفات میں تعطیل وتمثیل کرنے والوں کے درمیان ہیں، اللہ کے افعال میں جبریہ وقدریہ کے مابین ہیں، اللہ کی وعید میں مرجۂ اور وعیدی قدریہ کے مابین ہیں، دین اور ایمان کے ناموں میں حروریہ اور معتزلہ کے درمیان ہیں، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں رافضہ اور خوارج کے مابین ہیں۔"

15 مزید اہل السنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فهذه الفرقة الناجية أهل السنة والجماعة هي وسط في النحل كما أن ملة الإسلام وسط في الملل"[2]

"فرقہ ناجیہ' اہل السنۃ والجماعہ' اسی طرح ہی مسالک ومکاتبِ فکر کے وسط میں ہے، جس طرح ملت

[1] شرح العقيدة الواسطيه:124

[2] عقیدہ اہل السنہ والفرقہ الناجیہ:ص10، ناشر: انصار السنہ المحمدیہ، مصر

اسلام، دیگر ملتوں کے وسط میں ہے۔''

اسلام میں شدت پسندی نہیں ہے!

شدت، تشدد اور انتہا پسندی کے لیے یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں: غلُوّ، عُنف، تطرُّف اور اسلام ان سب رویّوں کی مذمت کرتا ہے، یعنی انتہا پسندی کی ہر صورت کا مخالف ہے۔ قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ میں اُن کی مخالفت و تردید بیان ہوئی ہے۔

1 غلو کا مطلب حد سے تجاوز کرنا جیسے کہ سورۃ النساء میں ہے:

﴿يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ وَلَا تَقُولُواْ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلۡحَقَّۚ﴾ (آیت 171)[1]

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ گزرو اور اللہ پر مت کہو مگر حق۔''

یہی جملہ سورۃ المائدۃ میں بھی بیان ہوا ہے:

﴿يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ ...﴾ (آیت 77)

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو۔''

2 سورۃ النساء والی آیت کی تفسیر میں مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''غلو کا معنیٰ ایسا مبالغہ ہے جو غیر معقول ہو۔ خواہ یہ مبالغہ افراط کی جانب ہو یا تفریط کی جانب۔ جیسے عیسیٰ کے متعلق نصاریٰ کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ کے بیٹے تھے اور اس کے بالکل برعکس یہود کا یہ عقیدہ کہ وہ نبی نہ تھے بلکہ یہود (معاذ اللہ) اُنہیں ولد الحرام سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے آپ کو سولی پر چڑھانے میں اپنی کوششیں صرف کر دیں۔ گویا ایک ہی رسول کے بارے میں غلو کی بنا پر اہل کتاب کے دونوں بڑے فرقے گمراہ ہو گئے۔''

3 سورۃ النساء والی آیت کی تفسیر میں حافظ عبدالسلام بھٹوی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''بعض علما نے لکھا ہے کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے، اس لیے کہ 'غلو' راہِ اعتدال کے چھوڑ

[1] لسان العرب: 15/132

دینے کا نام ہے اور یہ افراط وتفریط (زیادتی اور کمی) دونوں صورتوں میں ہے۔ایک طرف نصاریٰ نے مسیح کے بارے میں افراط سے کام لے کر ان کو اللہ کا بیٹا قرار دے رکھا تھا،تو دوسری طرف یہود نے مسیح سے متعلق یہاں تک تفریط برتی کہ ان کی رسالت کا بھی انکار کر دیا،قرآن نے بتایا کہ یہ دونوں فریق غلو کر رہے ہیں۔اعتدال کی راہ یہ ہے کہ عیسیٰ نہ تو اللہ کے بیٹے ہیں کہ ان کو معبود بنالیا جائے اور نہ جھوٹے نبی ہیں، بلکہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔''

4 اسی آیت کی تفسیر میں حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''غلو کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کی حد سے بڑھا دینا۔جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کے بارے میں کیا کہ انہیں رسالت و بندگی کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کے مقام پر فائز کر دیا اور اُن کی اللہ تعالیٰ کی طرح عبادت کرنے لگے۔اسی طرح حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں کو بھی غلو کا مظاہرہ کرتے ہوئے معصوم بنا ڈالا اور ان کو حرام وحلال کے اختیار سے نواز دیا۔...اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہل کتاب کو دین میں اسی غلو سے منع فرمایا ہے۔نبی ﷺ نے بھی عیسائیوں کے اس غلو کے پیش نظر اپنے بارے میں اپنی امت کو متنبہ فرمایا:''لَا تُطْرُونِي كَمَا أَطْرَتْ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ فَقُولُوا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُولُهُ''[1]''تم مجھے اس طرح حد سے نہ بڑھانا جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا، میں تو صرف اللہ کا بندہ ہوں، پس تم مجھے اس کا بندہ اور رسول ہی کہنا۔''لیکن افسوس اُمتِ محمدیہ اس کے باوجود بھی اس غلو سے محفوظ نہ رہ سکی جس میں عیسائی مبتلا ہوئے اور امت محمدیہ نے بھی اپنے پیغمبر کو بلکہ نیک بندوں تک کو خدائی صفات سے متصف ٹھہرا دیا جو دراصل عیسائیوں کا وطیرہ تھا۔''

5 سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ''حج کے دوران نبی کریم ﷺ نے رمی جمار کے لیے برابر کنکریوں کو جمع فرمایا اور انہیں ہاتھ میں لے کر فرمانے لگے:

---

[1] صحیح بخاری،کتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ...﴾: 3445

”أَمْثَالَ هٰؤُلَاءِ، فَارْمُوا“ ثُمَّ قَالَ: ’يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ“۔[1]

”ان جیسی کنکریاں مارو۔“ پھر فرمایا: ”لوگو! دین میں غلو (حد سے بڑھنے) سے پرہیز کرو۔ تم سے پہلے لوگوں کو دین میں غلو ہی نے تباہ کیا ہے۔“

6 سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ،وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ،فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا،وَأَبْشِرُوا،وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ“۔[2]

”بے شک دین آسان ہے اور جو شخص دین میں سختی اختیار کرے گا تو دین اس پر غالب آ جائے گا (اور اس کی سختی نہ چل سکے گی) پس اپنے عمل میں پختگی اختیار کرو۔ اور جہاں تک ممکن ہو میانہ روی برتو اور خوش ہو جاؤ (کہ اس طرز عمل سے تم کو دارین کے فوائد حاصل ہوں گے) اور صبح شام اور کسی قدر رات میں (عبادت سے) مدد حاصل کرو۔“

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

”والتسديد:العمل بالسداد،وهوالقصدوالتوسط في العبادة،فلا يقصر فيما أمر به، ولا يتحمل منها ما لا يطيقه“۔[3]

”سیدھا کرنے سے مراد عمل میں سدھار ہے۔ یعنی عبادات میں توسط اور میانہ روی اختیار کرنا، جس کا حکم ہے اس سے کمی نہ کرنا اور طاقت سے زیادہ کا بوجھ نہ اُٹھانا۔“

7 علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ غُلوّ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] سنن ابن ماجه، كتاب المناسك، باب قدر حصى الرمي: رقم 3029، السلسلة الصحيحة: رقم 1283

[2] صحیح بخاری، كتاب الإيمان، باب الدين يُسر : رقم 39

[3] المحجة في سير الدلجة از ابن رجب: ص51

"الغلو مجاوزة الحد: مجاوزة بأن يزاد في الشيء في حمده أو ذمه على ما يستحق ونحو ذلك"[1]

''غلو سے مراد 'حد سے تجاوز' کرنا ہے۔ یعنی کسی شے کی تعریف یا مذمت میں اس سے اضافہ کرنا جس کی وہ مستحق ہے۔''

8 عُنف اس شدت وسختی کو کہتے ہیں جو نرمی اور سہولت کے برعکس[2] ہو۔ جیسا کہ فرمانِ رسالت ہے:

''يَاعَائِشَةُ! إِنَّ اللّٰه رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ وَمَا لَا يُعْطِي عَلَى مَا سِوَاهُ''۔[3]

''اے عائشہ! بے شک اللہ تعالیٰ نرمی والا ہے اور نرمی ہی کو پسند کرتا ہے اور نرمی کی بنا پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو درشت مزاجی کی بنا پر عطا نہیں فرماتا، وہ اس کے علاوہ کسی اور بات پر اتنا عطا نہیں فرماتا۔''

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّ اللّٰه عَزَّ وَجَلَّ لَمْ يَبْعَثْنِي مُعَنِّفًا وَلٰكِنْ بَعَثَنِي مُعَلِّمًا مُيَسِّرًا''۔[4]

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے سختی کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ مجھے تو تعلیم دینے والا اور آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

9 تَطَـرُّف سے مراد: غلوّ، مبالغہ اور کسی شے کے انتہائی پہلو کو اختیار کر لینا۔[5]

غلو اور عنف کی مذمت زبان رسالت سے اوپر درج کی گئی ہے، جبکہ تطرف یعنی انتہا پسندی کا لفظ عربی زبان میں انہی مذموم معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ اسلام نے درجنوں مقامات پر نرمی کی تلقین کی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں سیدنا موسیٰ کو دربار فرعون میں جاتے ہوئے حکم ربانی ہوا:

---

[1] اقتضاء الصراط المستقيم از ابن تيميه: 1/ 289

[2] لسان العرب: 9/257

[3] صحيح مسلم، كتاب البروالصلة، باب فضل الرفق: 6601

[4] مسند احمد: 14555

[5] لسان العرب: 9/217

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ (سورۃ طٰہٰ:44)

''پس اس سے بات کرو، نرم بات، شاید کہ وہ نصیحت حاصل کر لے، یا ڈر جائے۔''

مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''فرعون سے جو بات کہیں نرمی کے لہجہ میں کہیں۔ کیونکہ سختی سے بات کرنے سے بسا اوقات الٹا اثر ہوتا ہے۔ مخاطب اصل بات سمجھنے کی بجائے طرزِ تخاطب اور لہجہ کی بنا پر ضد اور مخالفت پر اتر آتا ہے۔ گویا تبلیغ اور دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک نہایت اہم سبق ہے۔''

اور ایک فرمانِ رسالت ہے:

''إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ''۔[1]

''نرمی جس چیز میں بھی ہوتی ہے، اس کو زینت بخش دیتی ہے اور جس چیز سے بھی نرمی نکال دی جاتی ہے، اسے معیوب کر دیتی ہے۔''

''ارہاب'' کا مفہوم

اسلام نے توازن و اعتدال کے لیے وسط، وسطیٰ کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور اس کی ہر پہلو سے ترغیب دی ہے، جبکہ شدت پسندی کے لیے غلو اور عنف وغیرہ کے لفظ بولے ہیں، اور ان کی مذمت کی ہے۔ انہی معانی سے ملتا جلتا لفظ اِرہاب ہے۔ عربی زبان میں اس رَہَب کا مطلب 'ڈرانا، خوف دلانا اور دوسرے کو متفکر کرنا'[2] ہے۔ اسی لفظ کو 'دہشت گردی' کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں بارہ مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ اس کو تین بڑے معانی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل الرفق: 6602

[2] خافه ... وأَرْهَبه ورَهَّبَه واسترْهَبَه: أَخافَه وفَزَّعه (لسان العرب: 1/436، مفردات القرآن: ص 204 (رهب)

1. اللہ سے ڈر اور اس کی خشیت پر 5/آیات
2. ڈر میں زیادتی کی بنا پر عبادت میں غلو اختیار کرنا 4/آیات
3. لوگوں میں رعب اور خوف قائم کرنا 3/آیات

اجمالاً یہ پانچ آیات مندرجہ ذیل ہیں، جن میں پہلا مطلب پایا جاتا ہے:

1. ﴿وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ (سورۃ البقرۃ:40) ''اور صرف مجھ سے ہی ڈرو۔''
2. ﴿فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ (سورۃ النحل:51) ''پس صرف مجھ سے ہی ڈرو۔''
3. ﴿لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ﴾ (سورۃ الاعراف:154) ''وہ اپنے ربّ سے ہی ڈرتے ہیں۔''
4. ﴿وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا﴾ (سورۃ الانبیاء:90) ''اور وہ ہمیں اُمید اور خوف (کی ملی جلی کیفیت) سے پکارتے ہیں۔''
5. ﴿وَّ اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ﴾ (سورۃ القصص:32) ''اور خوف سے (بچنے کے لیے) اپنے بازو اپنی طرف ملا لے۔''

جبکہ ڈر میں زیادتی کی بنا پر عبادت میں 'رہبانیت' کے معنی میں چار آیات آئی ہیں:

1. ﴿مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا﴾ (سورۃ المائدۃ:82)
''ان میں علماء اور عبادت کے لیے گوشہ نشین درویش پائے جاتے ہیں۔''
2. ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (سورۃ التوبۃ:31)
''ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو ربّ بنایا ہے۔''
3. ﴿اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ (سورۃ التوبۃ:34)
''بہت سارے عالم اور راہب/درویش لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں۔''

4 ﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ﴾ (سورۃ الحدید:27)

''رہبانیت (ترکِ دنیا) تو ان لوگوں نے از خود ایجاد کر لی، ہم نے ان پر اسے واجب نہ کیا تھا۔''

تیسرے معنی یعنی خوف ودہشت اور رعب قائم کرنے کے معنی میں آنے والی آیات تین ہیں:

1 ﴿سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ﴾ (سورۃ الاعراف:116)

''تو لوگوں کی نگاہوں پر جادو کر دیا اور اُن پر دہشت غالب کر دی۔''

2 ﴿لَأَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ﴾ (سورۃ الحشر:13)

''(مسلمانو!) تمہاری ہیبت ان کے دلوں میں بہ نسبت اللہ کی ہیبت کے بہت زیادہ ہے۔''

3 ﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ (الانفال:60)

''تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی مقدور بھر قوت کی تیاری کرو اور گھوڑوں کو تیار رکھ کر اس سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ رکھو۔''

قرآن کریم میں 'رہب' کے مذکورہ اطلاقات کا جائزہ لیا جائے تو پہلی پانچ آیات میں اس کو مثبت مفہوم میں لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ اسی سے 'رہبت' کرو۔ اگلے چار اطلاقات ان معانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو عیسائیوں نے رہبانیت کے نام پر خرافات گھڑ لی تھیں، پھر آیات 10 اور 11 میں اللہ تعالیٰ نے اسے کفار کا وصف بتلایا ہے کہ وہ ڈر گئے۔ جبکہ آخری آیت میں اہل اسلام سے اس بات کا تقاضا کیا ہے کہ اتنی تیاری رکھو کہ دشمنوں پر اپنا خوف اور رعب قائم کر دو۔ چنانچہ علم ہوا کہ رہب وارہاب کے الفاظ مثبت اور منفی دونوں معانی کے لیے مستعمل ہیں، اور 'ارہاب' کو صرف منفی معنی میں استعمال کرنا قرآنی استعمال کے مخالف ہے۔ اس لیے دہشت گردی اور انتہا پسندی کی مذمت کے لیے ان اصطلاحات کا سہارا لینا چاہیے جو اسلامی لٹریچر میں صرف منفی مطلب کے لیے استعمال ہوئی ہیں (جیسے غلو اور عُنف وغیرہ) اور دین نے مسلمانوں کو ان سے روکا ہے۔ الغرض اصطلاح 'ارہاب' کے بارے میں بھی ہمیں انتہا پسندی کو ترک کرنا چاہیے۔

اسلام میں توازن واعتدال کے مظاہر

1 اسلام سراسر توازن واعتدال کو پروان چڑھاتا ہے، اور یہ توازن زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہ مشہور واقعہ اسی طرف رہنمائی کرتا ہے، جو سیدنا انس عنہ بن مالک رضی اللہ سے مروی ہے:

"جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى بُيُوتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا أُخْبِرُوا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوهَا فَقَالُوا وَأَيْنَ نَحْنُ مِنْ النَّبِيِّ ﷺ قَدْ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ. قَالَ أَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنَا فَإِنِّي أُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا وَقَالَ آخَرُ: أَنَا أَصُومُ الدَّهْرَ وَلَا أُفْطِرُ وَقَالَ آخَرُ: أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا. فَجَاءَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِلَيْهِمْ فَقَالَ: 'أَنْتُمْ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا أَمَا وَاللهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي'."[1]

"تین حضرات (سیدنا علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عمرو بن العاص اور عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم) نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھروں کی طرف آپ کی عبادت کے متعلق پوچھنے آئے، جب اُنہیں حضور اکرم ﷺ کا عمل بتایا گیا تو گویا اُنہوں نے اپنی روزمرہ کی عبادت کو انتہائی کم تر سمجھا اور کہا کہ ہم کہاں اور نبی ﷺ کہاں!! آپ کی تو تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف کردی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نے عزم کیا کہ آج سے میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے سے رہوں گا اور کبھی ناغہ نہیں ہونے دوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے جدائی اختیار کرلوں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ پھر آنحضرت ﷺ تشریف لائے

[1] صحیح بخاری،کتاب النکاح، باب الترغیب في النکاح:5063

اوران سے پوچھا: کیا تم نے ہی یہ باتیں کہی ہیں؟ سن لو! اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ ربّ العالمین سے میں تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ میں تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہوں لیکن میں روزے رکھتا ہوں اور کبھی نفلی روزے چھوڑ دیتا ہوں۔ رات کی نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ میری سنت سے جس نے بے رغبتی کی، وہ مجھ سے نہیں ہے۔''

2 نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مؤاخاتِ مدینہ میں سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ کے مابین بھائی چارہ قائم کردیا:

''فَزَارَسَلْمَانُ أَبَاالدَّرْدَاءِ،فَرَأَى أُمَّ الدَّرْدَاءِ مُتَبَذِّلَةً، فَقَالَ لَهَا:مَاشَأْنُكِ؟ قَالَتْ:أَخُوكَ أَبُوالدَّرْدَاءِلَيْسَ لَهُ حَاجَةٌ فِي الدُّنْيَا،فَجَاءَأَبُوالدَّرْدَاءِ، فَصَنَعَ لَهُ طَعَامًا، فَقَالَ:كُلْ فَإِنِّي صَائِمٌ، قَالَ: مَا أَنَا بِآكِلٍ حَتَّى تَأْكُلَ، فَأَكَلَ، فَلَمَّا كَانَ اللَّيْلُ ذَهَبَ أَبُوالدَّرْدَاءِ يَقُومُ، فَقَالَ: نَمْ، فَنَامَ، ثُمَّ ذَهَبَ يَقُومُ، فَقَالَ:نَمْ، فَلَمَّا كَانَ آخِرُ اللَّيْلِ، قَالَ سَلْمَانُ:قُمِ الآنَ، قَالَ: فَصَلَّيَا، فَقَالَ لَهُ سَلْمَانُ: إِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا،وَلِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، فَأَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ، فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ:'صَدَقَ سَلْمَانُ''۔[1]

''ایک مرتبہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، ابودرداء رضی اللہ عنہ کی ملاقات کے لیے تشریف لائے اور اُمّ درداء رضی اللہ عنہا کو بڑی خستہ حالت میں دیکھا اور پوچھا: کیا حال ہے؟ وہ بولیں تمہارے بھائی ابودرداء کو دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ پھر ابودرداء تشریف لائے تو سلمان نے ان کے سامنے کھانا پیش کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ آپ کھائیے، میں روزے سے ہوں۔ سلمان فارسی بولے کہ میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا، جب تک آپ بھی نہ کھائیں۔ چنانچہ ابودرداء نے بھی کھایا، رات

[1] صحیح بخاری: 6139، کتاب الادب،باب صنع الطعام والتکلف للضیف

ہوئی تو ابو درداء نماز پڑھنے کی تیاری کرنے لگے۔ سلمان نے کہا کہ سو جایئے تو وہ سو گئے، (کچھ وقت گزرا) تو وہ پھر نماز تہجد کے لیے اُٹھے، تو سلمان نے کہا: سو جایئے (تو وہ سو گئے) پھر جب آخر رات ہوئی تو سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: اب اُٹھیے، بعد ازاں دونوں نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد سلمان نے کہا کہ بلاشبہ تمہارے ربّ کا تم پر حق ہے اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، پس سارے حق داروں کے حقوق ادا کرو۔ اس کے بعد وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اس کا ذکر کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان نے سچ کہا ہے۔''

3 مذکورہ بالا واقعات معاشرتی زندگی اور عبادات میں توازن واعتدال کا درس دیتے ہیں، عبادات میں توسط کی ایک اور اہم مثال یہ واقعہ بھی ہے، جسے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے:

''دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ فَإِذَا حَبْلٌ مَمْدُودٌ بَيْنَ السَّارِيَتَيْنِ فَقَالَ: 'مَا هٰذَا الْحَبْلُ ؟ قَالُوا: هٰذَا حَبْلٌ لِزَيْنَبَ. فَإِذَا فَتَرَتْ تَعَلَّقَتْ. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: 'لَا، حُلُّوهُ لِيُصَلِّ أَحَدُكُمْ نَشَاطَهُ، فَإِذَا فَتَرَ فَلْيَقْعُدْ''۔[1]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے۔ آپ کی نظر ایک رسّی پر پڑی جو دو ستونوں کے درمیان تنی ہوئی تھی۔ دریافت فرمایا کہ یہ رسّی کیسی ہے؟ لوگوں نے عرض کی کہ یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے باندھی ہے، جب وہ (نماز میں کھڑی کھڑی) تھک جاتی ہیں تو اس کا سہارا لے لیتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نہیں یہ رسّی نہیں ہونی چاہیے، اسے کھول ڈالو۔ تم میں ہر شخص کو چاہیے کہ جب تک دل لگے نماز پڑھے، تھک جائے تو بیٹھ جائے۔''

اس حدیث پر امام بخاری نے یہ عنوان قائم کیا ہے: ''باب ما يُكره من التشديد في العبادة'' یعنی

[1] صحیح بخاری: 1150، كتاب التهجد، باب ما يكره من التشديد في العبادة

''عبادت میں شدت اختیار کرنا ناپسندیدہ ہے۔''

4 ایک عورت ساری رات عبادت کرتی رہتی، نبی کریم ﷺ نے اسے، اس عمل سے روک دیا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

''كَانَتْ عِنْدِي امْرَأَةٌ مِنْ بَنِي أَسَدٍ فَدَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: 'مَنْ هَذِهِ؟' قُلْتُ: فُلَانَةُ لَا تَنَامُ بِاللَّيْلِ، فَذُكِرَ مِنْ صَلَاتِهَا. فَقَالَ: 'مَهْ، عَلَيْكُمْ مَا تُطِيقُونَ مِنْ الْأَعْمَالِ، فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتَّى تَمَلُّوا''۔[1]

''میرے پاس بنو اسد کی ایک عورت بیٹھی تھی۔ نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو ان کے متعلق پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ فلاں خاتون ہیں جو رات بھر نہیں سوتیں۔ ان کی نماز کا آپ کے سامنے ذکر کیا گیا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ بس تمہیں صرف اتنا ہی عمل کرنا چاہیے جتنے کی تم میں طاقت ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو (ثواب دینے سے) تھکتا ہی نہیں، تم ہی عمل کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔''

5 خرچ کرنے میں بھی اسلام اسی توسط و اعتدال کا حکم دیتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ (سورۃ الفرقان: 67)

''اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل بلکہ ان کا خرچ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر رہتا ہے۔''

مفسر قرآن مولانا حافظ عبد السلام بھٹوی حفظہ اللہ اپنی تفسیر میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسراف کا اطلاق کسی کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے پر ہوتا ہے، مثلاً کھانے پینے یا لباس یا مکان یا شادی بیاہ وغیرہ پر بے دریغ خرچ کر دینا۔ ایک بلب کی ضرورت ہو تو زیادہ بلب لگا دینا، تھوڑے پانی سے کام چلتا ہو تو بے دریغ پانی بہا دینا۔ یا اپنی ہمت اور مقدور سے زیادہ خرچ کر دینا، پھر قرض اتارتے

[1] صحيح بخاری: 1151 كتاب التهجد، باب ما يكره من التشديد في العبادة

رہنا یا مانگنا شروع کر دینا۔ ایسی فضول خرچیوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ پھر اسراف کی ایک قسم تبذیر ہے، جس کا معنی ہے بلاضرورت خرچ کرنا، مثلاً دن کو بھی گلی میں بلب جلائے رکھنا، یا پانی کی ٹونٹی کھلی چھوڑ دینا۔ اسی طرح ناجائز کاموں میں خرچ کرنا بھی تبذیر ہے، جیسے شراب، زنا، جوئے، گانے بجانے یا آتش بازی وغیرہ ایسے کاموں میں ایک پیسہ بھی خرچ کرنا حرام ہے۔ اسراف کی ضد قتور ہے، جو قَتَرَ يَقْتُرُ قَتْرًا وَ قُتُوْرًا سے ہے۔ باب 'افعال' اور 'تفعیل' سے إِقْتَارٌ اور تَقْتِيْرٌ بھی اسی معنی میں آتا ہے، یعنی خرچ میں تنگی کرنا، شدید بخل کہ مقدور ہوتے ہوئے بھی ضرورت سے کم خرچ کرنا اور مال کو جوڑ جوڑ کر رکھنا، اپنی ذات اور اہل و عیال کی جائز ضروریات میں بھی بخل کرنا۔ اسراف اور تقتیر کے درمیان کی صفت کا نام اقتصاد (میانہ روی) ہے، یعنی اتنا خرچ کرنا جتنی ضرورت ہے اور جتنی ہمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ﴿بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ قَوَامٌ دو چیزوں کے عین درمیان کو کہتے ہیں۔ مزید دیکھیے تفسیر القرآن الکریم، سورۃ انعام (۱۴۲)، اعراف (۳۱) اور بنی اسرائیل (۲۶، ۲۹)۔"

مفسر قرآن مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اسراف اور بخل کے درمیان کی صفت کا نام اقتصاد یا قصد ہے اور اسی صفت کو اسلام نے پسند کیا ہے۔ اقتصاد یہ ہے کہ انسان اپنی جائز ضرورتوں پر خرچ اور اتنا ہی خرچ کرے جتنا ضروری ہو نہ کم نہ زیادہ۔ حتیٰ کہ اگر اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو تو بھی یہی بات مدنظر رکھنی چاہیے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "صدقہ وہی بہتر ہے جس کے بعد انسان خود محتاج نہ ہو جائے۔"[1] اور اعتدال کی روش اختیار کرنے کے بعد اگر کسی کے پاس مال بچ رہتا ہے تو اسے اپنے اقربا اور دوسرے حاجت مندوں کی ضرورتوں پر خرچ کرنا چاہیے۔"

عقائد میں توسط واعتدال

اسلام ہر پہلو سے توازن واعتدال کا درس دیتا ہے، یہ اعتدال اسلامی تعلیمات میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔

[1] صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب وجوب النفقة علی الأهل و العيال

عقائد، ارکانِ ایمان، عبادات و معاملات اور نکاح وطلاق میں اس کی دسیوں مثالیں موجود ہیں۔ عقائد ونظریات چونکہ انسانی اعمال کی اساس ہیں، اس لیے اسلامی عقائد میں یہ توازن وتوسط، عملی رویّہ کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ذکر ہو چکا ہے کہ مسلمان مغضوب علیہم یعنی یہود اور ضالین یعنی نصاریٰ کے مابین ہیں۔ اور اسلام نام ہی صراطِ مستقیم کا ہے جو مختلف انتہائی راستوں کے مابین ہے۔ سیدنا عیسیٰ اور سیدہ مریم علیہما السلام کے بارے میں اسلامی عقیدہ جو مبنی برحق اور قرآن کریم میں بیان ہوا ہے، اسے سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے سن کر نجاشی یہ کہہ اُٹھا تھا کہ اس میں کوئی افراط وتفریط نہیں اور یہی عین حق ہے۔ اسی طرح امام شعبی اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ کی زبانی مختلف فرقوں کے رجحانات کے مابین متوسط اعتقاد کا حامل اہل السنہ اور سلفیہ کو قرار دیا گیا ہے۔

ماضی میں کبیرہ گناہ کے ارتکاب کے مسئلے پر مسلمانوں میں کئی فرقے بنے۔ معتزلہ اور خوارج کا موقف یہ تھا کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب خارج از اسلام ہے، اور آخرت میں وہ جہنمی ہے۔ مرجئہ اس کے بالمقابل اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ کبیرہ گناہ کرنے والے کے ایمان میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ جبکہ سلفیہ اور اہل السنہ والجماعہ کا مشہور موقف 'دونوں کے مابین' ہے۔ چنانچہ عقائد کی مستند ترین کتاب شرح عقیدہ طحاویہ میں ہے:

"فَهَؤُلَاءِ فِي طَرَفٍ،وَالْخَوَارِجُ فِي طَرَفٍ، فَإِنَّهمْ يَقُولُونَ نُكَفِّرُ الْمُسْلِمَ بِكُلِّ ذَنْبٍ، أَوْ بِكُلِّ ذَنْبٍ كَبِيرٍ، وَكَذَلِكَ الْمُعْتَزِلَةُ الَّذِينَ يَقُولُونَ يَحْبَطُ إِيمَانُهُ كُلُّهُ بِالْكَبِيرَةِ، فَلَا يَبْقَى مَعَهُ شَيْءٌ مِنَ الْإِيمَانِ. لَكِنَّ الْخَوَارِجَ يَقُولُونَ: يَخْرُجُ مِنَ الْإِيمَانِ وَيَدْخُلُ فِي الْكُفْرِ! وَالْمُعْتَزِلَةُ يَقُولُونَ: يَخْرُجُ مِنَ الْإِيمَانِ وَلَا يَدْخُلُ فِي الْكُفْرِ، وَهَذِهِ الْمَنْزِلَةُ بَيْنَ الْمَنْزِلَتَيْنِ!! وَبِقَوْلِهِمْ بِخُرُوجِهِ مِنَ الْإِيمَانِ أَوْجَبُوا لَهُ الْخُلُودَ فِي النَّارِ!...أَنَّ أَهْلَ السُّنَّةِ مُتَّفِقُونَ كُلُّهُمْ عَلَى أَنَّ مُرْتَكِبَ الْكَبِيرَةِ لَا يَكْفُرُ كُفْرًا يَنْقُلُ عَنِ الْمِلَّةِ بِالْكُلِّيَّةِ، وَأَهْلُ السُّنَّةِ أَيْضًا مُتَّفِقُونَ عَلَى أَنَّهُ يَسْتَحِقُّ الْوَعِيدَ الْمُرَتَّبَ عَلَى ذَلِكَ الذَّنْبِ، كَمَا وَرَدَتْ بِهِ النُّصُوصُ، لَا كَمَا يَقُولُهُ الْمُرْجِئَةُ مِنْ أَنَّهُ لَا يَضُرُّ مَعَ الْإِيمَانِ ذَنْبٌ، وَلَا يَنْفَعُ مَعَ الْكُفْرِ طَاعَةٌ! وَإِذَا اجْتَمَعَتْ نُصُوصُ الْوَعْدِ الَّتِي اسْتَدَلَّتْ بِهَا الْمُرْجِئَةُ، وَنُصُوصُ الْوَعِيدِ التي استدلت بها الخوارج

والمعتزلة، تبين لَكَ فَسَادُ الْقَوْلَيْنِ "۔[1]

"مرجئہ ایک انتہا پر ہیں اور خوارج دوسری انتہا پر۔ خوارج کا کہنا ہے کہ ہر گناہ یا کبیرہ گناہ کی بنا پر ہم مسلمان کی تکفیر کریں گے، اور ایسے ہی معتزلہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہر کبیرہ گناہ کے ساتھ ایمان ضائع ہوجاتا ہے اور ایمان کا کچھ بھی حصہ باقی نہیں رہتا۔ تاہم خوارج کہتے ہیں کہ وہ شخص اسلام سے نکل کر کفر میں داخل ہوگیا اور معتزلہ کہتے ہیں کہ ایمان سے تو نکل گیا لیکن کفر میں داخل ہونے کی بجائے منزلہ بین المنزلتین میں ہے۔ اور دونوں کا موقف ہے کہ ایمان سے نکل جانے کی بنا پر اب وہ آخرت میں دائمی جہنمی ہوگا۔ جبکہ اہل السنّہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرتکبِ کبیرہ ایسا کافر نہیں جو کلی طور پر ملتِ اسلامیہ سے خارج ہوجائے اور اہل السنّہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ گناہ کرنے کی بنا پر وہ اس وعید کا مستحق ہے جو احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ نہ کہ مرجئہ کی طرح کہ ایمان کے ساتھ گناہ کا کوئی نقصان ہی نہیں ہوتا اور کفر کے ساتھ طاعت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور جب آپ وعدۂ نجات کی نصوص کو جن سے مرجئہ استدلال کرتے ہیں اور وعید وسزا والی نصوص کو اکٹھا کریں گے تو دونوں کے موقفوں کی غلطی آپ پر واضح ہوجائے گی"۔

معتزلہ اور خوارج کا یہ موقف کہ گناہ گار شخص لازمی جہنمی ہے، اس موقف سے بھی اہل السنّہ کو اتفاق نہیں اور وہ کہتے ہیں کہ گناہ نہ تو زندگی میں کسی مسلمان کے کافر ہونے کی دلیل ہے ورنہ ہی یہ اس کے لازمی جہنم میں جانے کی وجہ ہے، اس سلسلے میں اہل السنّہ صحیح بخاری کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ

"أَنَّ رَجُلًا عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ كَانَ اسْمُهُ عَبْدَ اللهِ وَكَانَ يُلَقَّبُ حِمَارًا وَكَانَ يُضْحِكُ رَسُولَ اللهِ ﷺ وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ قَدْ جَلَدَهُ فِي الشَّرَابِ، فَأُتِيَ بِهِ يَوْمًا فَأَمَرَ بِهِ فَجُلِدَ فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ الْقَوْمِ: اللَّهُمَّ الْعَنْهُ مَا أَكْثَرَ مَا يُؤْتَى بِهِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: 'لَا تَلْعَنُوهُ فَوَاللهِ مَا عَلِمْتُ إِنَّهُ يُحِبُّ اللهَ وَرَسُولَهُ"۔[2]

---

[1] شرح عقیدہ طحاویہ از محمد ابن ابی العزحنفی: 298، طبع وزارت اوقاف، سعودی عرب 1418ھ

[2] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب ما یُکرہ من لعن شارب الخمر: 6780

''نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص، جس کا نام عبداللہ تھا اور 'حمار' (گدھا) کے لقب سے پکارے جاتے تھے، وہ آنحضرت ﷺ کو ہنساتے تھے اور آنحضرت ﷺ نے اُنہیں شراب پینے پر مارا تھا تو اُنہیں ایک دن لایا گیا اور آنحضرت ﷺ نے اُن کے لیے حکم دیا اور اُنہیں مارا گیا۔ حاضرین میں ایک صاحب نے کہا: اللہ اس پر لعنت کرے! کتنی مرتبہ تجھے اس سزا کے لیے لایا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس پر لعنت نہ کرو، واللہ، میں نے اس کے متعلق یہی جانا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔''

اس واقعہ اور فرمان سے علم ہوا کہ گناہ گار شخص کے لیے لازمی نہیں کہ اس کو کافر قرار دیا اور اس پر لعنت کی جائے۔ ایسے ہی کسی گنہگار کے جہنمی ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرنا چاہئے، جیسا کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

''كَانَ رَجُلَانِ فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ مُتَوَاخِيَيْنِ فَكَانَ أَحَدُهُمَا يُذْنِبُ، وَالْآخَرُ مُجْتَهِدٌ فِي الْعِبَادَةِ، فَكَانَ لَا يَزَالُ الْمُجْتَهِدُ يَرَى الْآخَرَ عَلَى الذَّنْبِ، فَيَقُولُ: أَقْصِرْ، فَوَجَدَهُ يَوْمًا عَلَى ذَنْبٍ، فَقَالَ لَهُ: أَقْصِرْ، فَقَالَ: خَلِّنِي وَرَبِّي! أَبُعِثْتَ عَلَيَّ رَقِيبًا؟! فَقَالَ: وَاللَّهِ لَا يَغْفِرُ اللَّهُ لَكَ- أَوْ- لَا يُدْخِلُكَ اللَّهُ الْجَنَّةَ، فَقَبَضَ أَرْوَاحَهُمَا، فَاجْتَمَعَا عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِينَ، فَقَالَ لِهَذَا الْمُجْتَهِدِ: أَكُنْتَ بِي عَالِمًا؟ أَوْ كُنْتَ عَلَى مَا فِي يَدِي قَادِرًا؟ وَقَالَ لِلْمُذْنِبِ: اذْهَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِي، وَقَالَ لِلْآخَرِ: اذْهَبُوا بِهِ إِلَى النَّارِ. قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ:

﴿وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَوْبَقَتْ دُنْيَاهُ وَآخِرَتَهُ﴾ [1]

"بنو اسرائیل میں دو آدمی آپس میں بھائی بنے ہوئے تھے۔ ایک گناہوں میں ملوث تھا جب کہ دوسرا عبادت میں کوشاں رہتا تھا۔ عبادت میں راغب جب بھی دوسرے کو گناہ میں دیکھتا تو اسے کہتا کہ باز آ جا۔ آخر ایک دن اس نے دوسرے کو گناہ میں پایا تو اسے کہا کہ باز آ جا۔ اس نے کہا: مجھے رہنے دے، میرا معاملہ میرے ربّ کے ساتھ ہے، کیا تو مجھ پر کوئی چوکیدار بنا کر بھیجا گیا ہے؟

[1] سنن ابی داود، کتاب الادب: 4901، صحیح کا قالہ الالبانی

تو اس نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تجھے معاف نہیں کرے گا یا تجھے جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ چنانچہ وہ دونوں فوت ہو گئے اور رب العالمین کے ہاں جمع ہوئے، تو اللہ نے عبادت میں کوشش کرنے والے سے فرمایا: "کیا تو میرے متعلق (زیادہ) جاننے والا تھا یا جو میرے ہاتھ میں ہے تجھے اس پر قدرت حاصل تھی؟ اور پھر گناہ گار سے فرمایا: جا میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جا۔ اور دوسرے کے متعلق فرمایا: اسے جہنم میں لے جاؤ۔" سیدنا ابو ہریرہ کہتے ہیں: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس نے ایسی بات کہہ دی جس نے اس کی دنیا اور آخرت تباہ کر کے رکھ دی۔''

سنن ابوداود کی اس حدیث پر شارح لکھتے ہیں:

''امر بالمعروف نہی عن المنکر کے مبارک اعمال میں مشغول افراد کو حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ نیز اُنھیں اپنے اعمالِ خیر پر کسی طرح دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کہ وہ یقیناً جنت میں چلے جائیں گے اور گنہگار مسلمانوں کے متعلق یہ وہم نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ اُنھیں معاف نہیں کرے گا یا وہ جنت میں نہیں جائیں گے۔ اللہ عزوجل کا میزانِ عدل بڑا دقیق اور عجیب ہے۔ اللہ عزوجل نے جو بھی فیصلے فرمائے اور جو فرمائے گا، وہ عدل ہی پر مبنی ہیں۔''[1]

مذکورہ بالا احادیث سے استدلال کرنے کے بعد شارح عقیدہ طحاویہ محمد بن ابی العز حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''فَإِنَّهُ مِنْ أَعْظَمِ الْبَغْيِ أَنْ يُشْهدَ عَلَى مُعَيَّنٍ أَنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ لَهُ وَلَا يَرْحَمُهُ بَلْ يُخَلِّدُهُ فِي النَّارِ، فَإِنَّ هَذَا حُكْمُ الْكَافِرِ بَعْدَ الْمَوْتِ'[2]

''سب سے بڑی سرکشی اور زیادتی یہ ہے کہ کسی متعین شخص کے بارے میں یہ گواہی صادر کر دی جائے کہ اللہ تعالیٰ نہ تو اسے معاف کرے گا اور نہ ہی رحم کرے گا، بلکہ اس کو ہمیشہ کے لیے جہنم رسید

---

[1] شرح دار السلام، عون المعبود

[2] شرح عقیدہ طحاویہ از محمد ابن ابی العز حنفی: ص 299، طبع وزارت اوقاف، سعودی عرب 1418ھ

کردے گا۔ ایسا صرف کافر کے بارے میں، اُس کی موت کے بعد کہا جا سکتا ہے۔''

عقیدہ طحاویہ کے متن پر سلفیہ کے امام شیخ ابن باز یوں رحمہ اللہ حاشیہ لکھتے ہیں:

"أن أهل السنة والجماعة لا يكفّرون المسلم الموحد المؤمن بالله واليوم الأخر بذنب يرتكبه كالزنا وشرب الخمر والربا وعقوق الوالدين وأمثال ذلك ما لم يستحل ذلك فإن استحله كفر لكونه بذلك مكذباً لله ولرسوله خارجاً عن دينه أما إذا لم يستحل ذلك فإنه لا يكفر عند أهل السنة والجماعة بل يكون ضعيف الإيمان وله حكم ما تعاطاه من المعاصي في التفسيق وإقامة الحدود وغير ذلك"[1]

''اہل السنہ والجماعہ کسی مسلم موحد اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے کو کبیرہ گناہ مثلاً زنا، شراب، والدین کی نافرمانی وغیرہ جیسے اُمور پر کافر قرار نہیں دیتے، جب تک وہ ان گناہوں کے حلال ہونے کا اعتقاد نہ رکھے۔ اگر وہ ان گناہوں کو جائز سمجھے گا، تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے صریح احکام کی تکذیب کی بنا پر وہ کافر ہوجائے گا۔ اگر جائز نہ سمجھے تو اہل السنہ والجماعہ کے نزدیک اس کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ وہ ضعیف الایمان ہوگا، اور شریعتِ مطہرہ کے احکام کے مطابق اس پر گناہوں کی سزا اور حدود کا نفاذ کیا جائے گا۔''

سلفی اور اہل السنّہ عقائد کے ہر باب میں توسط واعتدال کے قائل وفاعل ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو اسلام سے خارج تو نہیں کہا جائے گا، اور آخرت میں اس کے جہنمی ہونے کا فیصلہ بھی نہیں کیا جائے گا، تاہم اس کو ان سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا، جو شریعتِ اسلامیہ میں ذکر ہوئی ہیں۔ اور جب نبی کریم ﷺ نے بعض سنگین جرائم پر کفر کا اطلاق کیا ہے تو اس پر کفر کا اطلاق بھی کیا جائے گا، تاہم یہ کفر ملت سے خارج کرنے والا نہیں، بلکہ کفر عملی یا کفر حقیقی سے چھوٹا کفر (کفر دون کفر) کہلائے گا۔

بشکریہ ماہنامہ محدث (لاہور)

اشاعت جنوری 2017

[1] التعليقات الأثرية على العقيدة الطحاوية، تحت قَوْلِه: وَلَا نُكَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ بِذَنْبٍ، مَا لَمْ يَسْتَحِلَّهُ

علامات قیامت کی

تفسیر و تطبیق کے شرعی اصول اور ضابطے

خالد حسین گورایہ [1]

علامت سے مراد وہ نشانیاں ہیں جن کے ظہور سے ایک مومن قیامت کے قرب کا اندازہ کرسکتا ہے۔ اور ان کے مشاہدے سے اسے اس یوم عظیم کے قیام کا پختہ یقین ہوجاتا ہے کہ ایک دن اس نے رب تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونا ہے۔ اور اپنے کیے تمام اعمال کا حساب دینا ہے۔

شرعی نصوص میں وارد قیامت سے مراد اور اس کی اقسام:

شرعی نصوص میں تین طرح کی قیامت کا ذکر آیا ہے۔

پہلی قسم: قیامتِ کبریٰ (جسے الساعۃ الکبریٰ) کہا جاتا ہے۔ جس میں تمام دنیا کا نظام درہم برہم ہوجائے گا اور کائنات میں موجود ہر چیز نیست و نابود اور ہمیشہ کیلئے ختم ہوجائے گی، جس کے بارے میں قرآن مجید نے ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

﴿وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ﴾ [القمر:46]

---

[1] فاضل مدینہ یونیورسٹی، مدیر سہ ماہی البیان کراچی

ترجمہ: ''اور قیامت بڑی دہشت ناک اور تلخ تر ہے''۔

اور فرمایا: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ [القصص:88]

''اللہ کی ذات کے علاوہ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے''۔

دوسری قسم: ایک ہی صدی میں موجود تمام لوگوں کی موت کو بھی چند نصوص میں قیامت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان میں ہے جب آپ نے سیدنا عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو فرمایا:

''إن يطل عمر هذا الغلام لم يمت حتى تقوم الساعة''۔[1]

''اللہ تعالیٰ نے اس بچے کو اگر دراز عمر دی تو اس کی موت تک تم پر قیامت قائم ہو چکی ہوگی''۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''كان رجال من الأعراب يأتون النبي صلى الله عليه وسلم فيسألونه عن الساعة فكان ينظر إلى أصغرهم فيقول إن يعش هذا لا يدركه الهرم حتى تقوم عليكم ساعتكم''.[2]

ترجمہ: ''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہ کہتی ہیں کہ کچھ دیہاتی لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آیا کرتے اور یہ پوچھا کرتے تھے کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سن کر اس بچے کی طرف دیکھتے جو ان پوچھنے والوں کے ساتھ سب سے کم عمر ہوتا تھا اور پھر فرماتے کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا تو یہ بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے نہیں پائے گا کہ تم پر تمہاری قیامت قائم ہو جائے گی''۔

تیسری قسم: کسی فرد کی موت کو بھی قیامت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہر انسان کی قیامت اس کی موت کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

---

[1] المقصد العلى في زوائد أبي يعلىٰ الموصلي ،للهيثمى ـ طبعه دار الكتب العلمية نیز دیکھئے:
فتح البارى شرح صحيح البخارى ـشرح حديث نمبر 6511

[2] صحيح البخارى : كتاب الرقاق ، باب سكرات الموت ـ حديث 6511

﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا يَا حَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا﴾[الانعام:31]

ترجمہ: ''بلاشبہ جن لوگوں نے اللہ سے ملاقات (کی حقیقت) کو جھٹلایا وہ نقصان میں رہے حتیٰ کہ جب قیامت اچانک انہیں آلے گی تو کہیں گے، افسوس اس معاملہ میں ہم سے کیسی تقصیر ہوئی''۔

یہ جو حسرت انسان کو لاحق ہوگی یہ حسرت موت کے وقت بھی ہوگی اور روز قیامت بھی۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قال علماؤنا : و اعلم أن كل ميت مات فقدقامت قيامته و لكنها قيامة صغرى و كبرى فالصغرى هي ما يقوم على كل إنسان في خاصته من خروج روحه و فراق أهله و انقطاع سعيه و حصوله على عمله إن كان خيراً فخير و إن كان شراً فو شرا لقيامة الكبرى هي التي تعم الناس و تأخذهم أخذة واحدة و الدليل على أن كل ميت يموت فقد قامت قيامته قول النبي صلى الله عليه و سلم لقوم من الأعراب و قد سألوه متى القيامة ؟ فنظر إلى أحدث إنسان منهم فقال: (إن يعش هذا لم يدركه الهرم قامت عليكم ساعتكم)[1][2]

اہل علم فرماتے ہیں: ''جو شخص بھی فوت ہوجاتا ہے اس کی قیامت قائم ہوجاتی ہے۔ لیکن قیامت ایک قیامتِ صغریٰ ہے، اور ایک کبریٰ، قیامتِ صغریٰ وہ ہے جو ہر انسان کے ساتھ خاص ہے جس کا آغاز اس کی روح نکلنے، اہل و عیال کو داغِ مفارقت دینے، عمل کا سلسلہ منقطع ہونے اور اپنے عمل کی جزا پانے سے ہوتا ہے کہ اگر خیر ہے تو خیر اور شر ہے تو شر۔ اور قیامتِ کبریٰ وہ قیامت ہے جو سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور یک لخت نظام زندگی کو درہم برہم کردے گی۔ اور اس امر کی دلیل کہ ہر انسان کی موت سے اس کی قیامت بپا ہوجاتی

[1] صحيح البخاري:كتاب الرقاق،باب سكرات الموت

[2] ''التذكرة للقرطبي (ص: 240)

ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہے جو آپ نے چند اعراب کے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا جب آپ سے پوچھا گیا کہ قیام کب قائم ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے ایک نوخیز جوان کو دیکھا اور اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ''اگر یہ زندہ رہا تو اس کے بوڑھے ہونے تک تم لوگوں پر قیامت قائم ہو چکی ہوگی''۔

علامات قیامت کی اقسام:

امام محمد السفارینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اعلم أن أشراط الساعة وأماراتها تنقسم إلى ثلاثة أقسام: قسم ظهر وانقضى، وهي الأمارات البعيدة. وقسم ظهر ولم ينقض،بل لا يزال في زيادة حتى إذا بلغ الغاية ظهر القسم الثالث، وهي الأمارات القريبة الكبيرة التي تعقبها الساعة،وأنها متتابعة كنظام خرزات انقطع سلكها".[1]

ترجمہ ''جان رکھو کہ قیامت کی علامات اور اس کی نشانیاں تین طرح کی ہیں: ''ایک قسم وہ جو ظاہر ہو کر گذر چکی ہیں اور یہ امارات بعیدۃ ہیں۔ دوسری قسم وہ جو ظاہر تو ہو چکی ہیں لیکن ابھی وہ ختم نہیں ہوئیں (بلکہ ان کا تسلسل ابھی جاری وساری ہے) اور یہ بڑھتی جاتی ہیں یہاں تک تک تیسری قسم کی علامات کا ظہور شروع ہو جائے گا۔ اور تیسری قسم کی وہ علامات ہیں جو قیام قیامت کے عین قریب واقع ہوں گی اور ان کے متصل بعد قیامت قائم ہو جائے گی اور یہ علامات پے در پے ظاہر ہو رہی ہیں ایسے موتیوں کی طرح جن کی لڑی ٹوٹ چکی ہو (اور وہ) ایک ایک کر کے گر رہے ہوں''۔

علامات صغریٰ: سے مراد وہ علامتیں ہیں جو واقع ہو چکی ہیں اور ان کے وقوع پذیر ہونے کا زمانہ بھی کئی صدیاں پہلے گذر چکا ہے۔ ان علامات میں بطور مثال چند ایک یہ ہیں۔

[1] أهوال القيامة وعلاماتها الكبرى، ص8.

(ا) **نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت** آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بعثت أنا والساعة كهاتين ".[1]

'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (شہادت کی انگلی اور درمیان والی انگلی) کو ملا کر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا مجھے اور قیامت کو اس طرح ایک ساتھ بھیجا گیا ہے''یعنی جتنا فاصلہ ان دو انگلیوں کے مابین کا بنتا ہے اتنا ہی فاصلہ میرے اور قیامت کے درمیان ہے''۔

(2) **حجاز کی زمین سے آگ کا نکلنا:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت نہ قائم ہوگی یہاں تک کہ نکلے گی ایک آگ حجاز کے ملک سے، روشن کردے گی بصریٰ کے اونٹوں کی گردنوں کو۔"[2] (یعنی اس کی روشنی ایسی تیز ہوگی کہ عرب سے شام تک پہنچے گی، حجاز مکہ اور مدینہ کا ملک اور بصریٰ ایک شہر کا نام ہے)۔

(3) **جھوٹے نبیوں کا ظہور**۔ یہ بھی تاریخ سے ثابت ہو چکا کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ ظاہر ہوتے رہے جو گاہے بگاہے نبوت کا دعویٰ کرتے رہے۔

علاماتِ وسطیٰ: سے مراد وہ علامات ہیں جن میں سے بعض ظاہر ہو چکی ہیں اور ان کے ظہور کا سلسلہ متواتر جاری وساری ہے۔ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(1) نااہل، احمق اور کمینے لوگوں کا زمام حکومت سنبھالنا۔

(2) لوگوں کا مساجد بنانے اور ان کی تزئین وآرائش کرنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا۔

(3) علم کا اٹھ جانا، جہالت کا عام ہونا، کثرت سے شراب کا پیا جانا۔وغیرہ

امام بخاری رحمہ اللہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں انہوں نے فرمایا:

''لأحدثنكم حديثا سمعته من رسول الله - صلى الله عليه وسلم - لا يحدثكم به أحد غيري، سمعت رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يقول : "إن من أشراط الساعة أن

---

[1] رواه مسلم والترمذي:صحيح مسلم ـ كتاب الرقاق،باب قول النبي ﷺ بعثت انا والساعة كهاتين وما أمرالساعة إلا كلمح البصر الآية۔

[2] صحيح مسلم :حديث،7289 ترقيم فؤاد عبدالباقی

يرفع العلم، ويكثر الجهل ويكثر الزنا، ويكثر شرب الخمر، ويقل الرجال، ويكثر النساء حتى يكون لخمسين امرأة القيم الواحد".[1]

''انہوں نے (قتادہ) سے کہا (آج) میں تم سے ایک ایسی حدیث بیان کروں گا کہ میرے بعد کوئی تم سے بیان نہیں کرے گا میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا آپ فرماتے تھے کہ قیامت کی علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم کم ہوجائے اور جہل غالب آجائے اور زنا اعلانیہ ہونے لگے اور عورتوں کی کثرت اور مردوں کی قلت ہوجائے گی، یہاں تک پہنچے کہ پچاس عورتوں کا کفیل صرف ایک مرد ہوگا''۔

علامات کبریٰ: یعنی بڑی علامتیں ان کے ظہور کے بعد دنیا کا قیامت سے فاصلہ بہت کم رہ جائے گا۔ بلکہ چند علامات تو ایسی ہیں کہ عین انتہا پر نمودار ہوں گی۔

ان علامات میں دجال کا ظہور، عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، امام مہدی کا ظہور، یاجوج ماجوج کا نکلنا، زمین سے ایک جانور کا نکلنا، مغرب سے سورج کا طلوع ہونا وغیرہ شامل ہیں۔

علامات قیامت کی تفسیر کے حوالے سے قائم نظریات:

علامات قیامت کی تفسیر حوالے سے لوگوں میں بہت سی آراء اور نظریات پائے جاتے ہیں۔

پہلا نظریہ: علامات قیامت کا کلیۃً انکار ہے۔ اس باب میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں ایک وہ جو تمام علامات کے انکاری ہیں اور بعض وہ ہیں جو تمام علامات کا انکار تو نہیں کرتے لیکن چند علامات کا انکار کرتے ہیں۔

جیسے بعض خوارج، بعض جہمیہ اور بعض معتزلہ اور عقلانیوں کی اکثریت نے خروج دجال، نزول عیسیٰ علیہ السلام، یاجوج ماجوج کا نکلنا اور زمین سے جانور کے نکلنے کا انکار کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وَقَدْ خَالَفَ فِي ذَلِكَ بَعْض الْخَوَارِج وَالْمُعْتَزِلَة وَالْجَهْمِيَّة فَأَنْكَرُوا وُجُوده وَرَدُّوا الأَحَادِيث الصَّحِيحَة،وَذَهَبَ طَوَائِف مِنْهُمْ كَالْجُبَّائِيِّ

[1] صحيح البخاری: كتاب العلم باب رفع العلم وظهور الجهل رقم:81

إِلَى أَنَّهُ صَحِيح الْوُجُود، لكِنْ كُلّ الَّذِي مَعَهُ مَخَارِيق وَخَيَالات لا حَقِيقَة لَهَا". [1]

''دجال کے مسئلے میں بعض خوارج اور معتزلہ اور جہمیہ نے اختلاف کیا ہے جس کی بنا پر انہوں نے اس کے ظہور کا انکار کیا ہے اور اس باب میں وارد صحیح احادیث کو رد کر دیا، ان میں سے چند گروہ جیسا کہ جبائی (معتزلی) ہے نے اس کے وجود کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کا یہ کہنا ہے کہ دجال کے ساتھ جو بھی خلاف عادت امور اور شعبدہ بازیاں ہوں گی ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے''۔

عصرِ حاضر میں عقل پرستوں میں سے جن نے خروج دجال وغیرہ کا انکار کیا ان میں سرفہرست مصر کے محمد عبدہ اور دیگر محمد فہیم ابوعبیہ، محمود أبوریہ، محمد فرید وجدی، عبدالرزاق نوفل، أحمد أمین، انجینئر جواد عفانہ اور اہل قرآن (جن میں عبداللہ چکڑالوی اور اس کے ہمنوا شامل ہیں)۔ [2]

دوسرا نظریہ: علامات قیامت کے حوالے سے دوسرا گروہ وہ ہے جنہوں نے ان علامات کی اپنی من مانی تفسیر کی ہے جیسا کہ پرویزی فرقے کے نزدیک الساعۃ سے مراد یوم انقلاب ربوبیت ہے۔ اور قیامت کے دن وزن اعمال کا مطلب یہ ہے کہ جب نظام ربوبیت قائم ہو جائے گا تو ''کسی مزدور کی محنت میں کوئی کمی نہیں کر سکے گا اور محنت کرنے والے کی محنت کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوگا۔ اس کا حساب زمیندار یا سرمایہ دار نہیں کیا کرے گا کہ محنت کش کا حصہ کیا ہے اور اس کا حصہ کتنا ہے؟'' [3]

بعض نے دجال سے مراد یہ لیا ہے کہ مغرب میں شر کی علامت دجال ہے اور خیر کی علامت عیسیٰ علیہ السلام ہے، یعنی ان کے نزدیک مہدی اور عیسیٰ علیہما السلام سے مراد خیر کا شر پر غالب آنا ہے اور دجال سے مراد فتنہ کا پروان چڑھنا اور ایک وقت میں گمراہی وشر کا بول بالا ہونے سے مراد جال ہے۔ [4]

---

[1] فتح الباری 13/131

[2] موقف أهل السنة والجماعة من تنزيل نصوص الفتن وأشراط الساعة على الحوادث ، زاهر بن محمد بن سعيد الشهري ص 78

[3] نظام ربوبيت : ص 265

[4] الغیبات فی ضوءالسنة، محمد همام ص191، نهاية العالم، منصور عبدالحکیم ص218

علامت قیامت سے متعلق اہل سنت والجماعت کا نظریہ:

اہل سنت والجماعت جنہیں اہل حدیث بھی کہا جاتا ہے ان کا نظریہ جو علامات قیامت کے حوالے سے قائم ہے اسے چند نکات میں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

(1) علامات قیامت کا مصدر صرف اور صرف قرآن وحدیث ہے باب اجتہاد کا اس میں کوئی دخل نہیں بلکہ یہ باب اخبار پر قائم ہے جس کا مستند ترین ذریعہ صرف اور صرف کتاب وسنت ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی ذریعہ چاہے وہ اسرائیلی روایات کی شکل میں ہو یا فردی آراء ان کی علامات قیامت کے ثبوت میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس منہج کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ’’فهذا كتاب الفتن والملاحم في آخر الزمان، مما أخبر به رسول الله، وذكر أشراط الساعة، والأمور العظام التي تكون قبل يوم القيامة،مما يجب الإيمان به؛ لإخبار الصادق المصدوق عنها الذي لا ينطق عن الهوى إن هو إلا وحي يوحى)[1]

’’یہ آخری زمانے میں نمودار ہونے والے ان فتنوں اور شر وفساد کے بیان پر مشتمل کتاب ہے جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں خبر دی ہے۔ اس میں قیامت کی علامات اور ان امور عظام کا بیان بھی ہے جو قیامت سے قبل رونما ہوں گے۔ جن پر ایمان لانا واجب ہے، کیونکہ ہمیں اس کی خبر اس صادق ومصدوق ہستی نے دی ہے جو اپنی رائے سے کوئی بات نہیں کرتے بلکہ یہ سب وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے‘‘۔

(2) علامات قیامت کے بیان کا مقصد لوگوں کو بری عاقبت سے ڈرانا اور اور انہیں غفلت سے بیدار کرنا ہے۔ نہ کہ دیومالائی قصوں کی طرح انہیں پڑھنا اور پڑھانا اور اپنی پوائنٹ سکورنگ کیلئے ان کی تطبیق بیان کرنا ہے۔

---

[1] النهاية في الفتن والملاحم 11/1.

علامہ ابوعمرو الدانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’قد بعثني ما أخذه الله عزوجل من الميثاق والعهد على أهل العلم والرواية في نشر ماعلموه، وأداء ماسمعوه، أن أجمع في هذا الكتاب جملة كافية من السنن الواردة في الفتن وغوائلها، والأزمنة وفسادها، والساعة وأشراطها، لكي يتأدب بها المؤمن العاقل، ويأخذ نفسه برعايتها ويجهدها في استعمالها، والتمسك بها، ويتبين له بذلك عظيم ماحل بالإسلام وأهله، من سفك الدماء، ونهب الأموال،واستباحة الحرم وغير ذلك مما يذهب الدين، ويضعف الإيمان، فيعمل نفسه في إصلاح شأنه خوفاً منه على فساد دينه وذهابه‘‘.[1]

’’اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ توفیق دی کہ اس میثاق کی رو سے جو اس نے اہل علم وروایت سے لیا ہے کہ انہوں نے جو سیکھا ہے اسے نشر کریں اور جو سنا ہے اسے آگے ادا کریں۔ اسی مشن کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے اس کتاب میں فتنوں کے حوالے سے وارد احادیث، زمانہ کے فساد کے حوالے سے اخبار اور قیامت اور اس کی علامات کے حوالے سے وارد سنن کی ایک کافی تعداد اس کتاب میں جمع کردوں تاکہ ایک عقل مند مومن خود کو ان واقعات کی روشنی میں سدھارے، اور وہ اپنے نفس کی تہذیب واصلاح کرے اور ان نصوص کو سیکھنے میں محنت کرے، اور انہیں تھامنے واختیار کرنے کیلئے کاوش کرے، اس سے اسے معلوم ہوگا کہ اسلام اور اہل اسلام پر کیسے مصائب وآلام گزرے ہیں، جن میں خونریزی، ڈاکہ زنی، عزتوں کا داؤ پر لگنا وغیرہ شامل ہے ایسی چیزیں جو ایمان کو کمزور کرتی ہیں اور دین کے خاتمے کا باعث بنتی ہیں۔ تو وہ انہیں پڑھ کر اپنے معاملات کو سدھارے گا اس ڈر سے کہ کہیں اس کا دین تباہ نہ ہوجائے اور اس کا ایمان کہیں ضائع نہ ہوجائے‘‘۔

اور علامہ صدیق حسن خان رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: ’’إن المراد من تأليف هذا الكتاب في هذا الزمان المملوء من الآفات، والأكدار بالشيء الكثير: حفظ جملة صالحة من الأحاديث

---

[1] السنن الواردة في الفتن وغوائلها والساعة وأشراطها 1/ 178.

الواردة في أبواب الفتن وأسبابها على المسلمين، على طريق الاختصار، وضبط أشراط الساعة التي وردت في الآثار، وذَكرها عامة أهل الحديث في دواوينهم الكبار، تذكرة لأهل الغفلة والاغترار، وتبصرة لأولي البصائر والأبصار، فعسى أن ينتهوا عن بعض الذنوب، وينتبهوا عن سنة الغفلة، وتلين منهم قاسيات القلوب، ويغتنموا المهلة قبل الوهلة، كيف لا والدنيا قد ولت جداً وآذنت بالانصرام، ومرت بأهلها مر السحاب وهم نيام).[1]

''آفات ومصائب اور فتنوں سے بھرپور اس دور میں اس کتاب کی تالیف کا مقصد یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں پر درآنے والے فتنوں اور ان کے اسباب کے حوالے سے وارد صحیح روایات کی وافر تعداد اختصارا جمع کردی جائے ، اور قیامت کی وہ علامات بھی بیان کردی جائیں جو احادیث میں بیان ہوئی ہیں، جنہیں اہل حدیث نے اپنے بڑے دواوین میں ذکر کیا ہے۔ اس کا مقصد ان لوگوں کو یاددہانی کرانا ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، اور عقل وبصیرت رکھنے والے اس سے نصیحت پکڑیں۔ کاش کہ وہ ان کی وجہ سے بعض گناہوں سے باز آجائیں، اور غفلت کی نیند سے بیدار ہوجائیں، سخت دل نرم پڑ جائیں، اور وہ لوگ اس مہلت کو غنیمت جانیں قبل اس کے کہ ان پر دھاوا بول دیا جائے۔ اور یہ کیسے نہ ہو کہ دنیا تو پلٹ کر جارہی ہے اور رخصتی کا الارم بجارہی ہے، اور دنیا اہل دنیا پر سے ایسے گذر گئی ہے جیسے بادل گذر جاتے ہیں اور لوگ سوتے رہے''۔

(3) قیامت کے حوالے سے جو نصوص قرآن وحدیث میں ذکر ہوئی ہیں انہیں اپنی حقیقت پر محمول کرنا نہ کہ ان کا کوئی مجازی یا غیر حقیقی معنیٰ متعین کرنا ہے۔ جیسا کہ دجال کا ظہور ہے اہل سنت اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دجال ایک فرد ہے اس کی ہیئت اور صفات بالکل حقیقی صفات ہیں۔ اسی طرح زمین سے جانور کا ظہور اور بندے کا اپنے جوتے کے تسمے سے بات کرنا اور درخت کا یہ پکار کر

[1] الإذاعة لما كان وما يكون بين أشراط الساعةص15.

کہنا کہ میرے پیچھے یہودی ہے اسے قتل کرو۔ یہ سب حقیقت ہے اس میں کسی قسم کا بھی مجازی معنیٰ نہیں ہے۔ جیسا کہ اہل سنت کے ائمہ نے اپنی کتب میں اس نظریے کو بالکل وضاحت سے بیان فرمادیا ہے۔جن میں امام ابن کثیر امام قرطبی وغیرہم شامل ہیں۔

(4) علامات قیامت کو سامنے رکھتے ہوئے انسان اپنے دین کی حفاظت کرسکتا ہے اور خود کو فتنوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے یہ بھی ان علامات کے بیان کے مقاصد میں سے ایک بنیادی مقصد ہے۔

اس نکتہ کو یوں سمجھا جائے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ہمیں دجال سے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ہمیں یہ بتایا ہے کہ اس کی داہنی آنکھ کیسی ہوگی اور اس کی باہنی آنکھ کیسی ہوگی؟ اس کی پیشانی پر کیا لکھا ہوگا۔ پھر یہ بھی ہمیں بتایا کہ وہ کون کون سی شعبدہ بازیوں کا اظہار کرے گا۔ آسمان سے کہے گا بارش برساؤ، زمین سے کہے گا اناج اگاؤ، مردوں کو زندہ کرنے، بیماروں کو شفا دینے کے کرتب دکھائے گا۔ان تمام تفصیلات سے ہمیں اس لئے آگاہ کیا ہے تا کہ ہم اس کے اندھا کر دینے والے فتنوں سے خود کو محفوظ رکھ سکیں اور اس کی چالوں سے خود کو بچا کر رکھیں۔

اس کی ایک تطبیقی مثال سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت میں ملاحظہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ علیہ وسلم نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"يا عثمان إن الله مقمصك قميصًا، فإن أرادك المنافقون على خلعه، فلا تخلعه"[1]

''اے عثمان اللہ تجھے ایک قمیص پہنائے گا۔اگر منافق لوگ تجھ سے مطالبہ کریں کہ اسے اتار دو تو آپ اسے مت اتارنا''۔

اس قمیص سے مراد خلافت تھی۔ رسول ﷺ نے اشارہ سے بتایا کہ اللہ آپ کو خلافت نصیب کرے گا اور اگر منافق لوگ آپ سے خلافت چھوڑنے کا کہیں تو مت چھوڑیے گا۔ آپ ﷺ کے اس نشانی اور علامت بتانے اور ہدایت دینے کے مطابق ہی سیدنا عثمان نے برتاؤ کیا لہٰذا ان کی

[1] رواه الحاكم في المستدرك: 4544، وصححه الألباني صحيح الجامع: 7947

خلافت کے آخری ایام میں جب باغیوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ خلافت سے مستعفی ہو جائیں تو سیدنا عثمان نے شہید ہونا منظور کرلیا لیکن مستعفی نہیں ہوئے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گئی اس نصیحت پر عمل کیا۔

اسی طرح علامات قیامت کا تفصیلاً بیان کیا جانا اپنے اندر یہ مقصد لئے ہوئے ہے کہ اس کی تفصیلات پڑھ کر ہم اپنا ایمان محفوظ رکھ سکیں۔ والعلم عنداللہ

شرعی ضوابط کے بیان کا بنیادی مقصد:

ہم یہاں یہ بات واضح کرتے جائیں کہ ان ضوابط سے مراد یہ نہیں کہ کسی بھی حادثے کی تفسیر نہ کی جائے اور واقع ہونے والے حادثات سے کسی علامت قیامت کو بالکل میچ نہ کیا جائے۔ یہ مقصود نہیں بلکہ سلف جن میں صحابہ وتابعین شامل ہیں انہوں نے کئی علامات قیامت کی تفسیر و تطبیق بیان کی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے واضح کردیا کہ علامات قیامت تین طرح کی ہیں ایک وہ جو ظاہر ہو چکی، دوسری وہ جو ہورہی ہیں اور تسلسل سے ہوتی رہیں گی، اور تیسری وہ عظیم الشان علامات جن کے ظہور کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں جیسے ظہور دجال، نزول مسیح وغیرہ۔ بلکہ یہاں مقصد یہ ہے کہ ان علامات کو مخصوص اور متعین افراد پر لاگو کرنا، مخصوص حادثات کے ساتھ نتھی کرنا اور یہ کہنا فلاں ابن فلاں جو حدیث میں وارد ہوا ہے وہ یہ شخص ہے۔ یا یہ کہنا کہ یہ جو واقعہ رونما ہوا ہے یہ وہی ہے جو علامت قیامت کی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے۔ اور اسی پر اڑے رہنا وغیرہ۔ یا یہ کہ ان واقعات کی من مانی تفسیر بیان کرنا کہ دجال سے مراد شر کا غلبہ یا امریکہ ہے۔ اور دجلہ وفرات کے خزانے اگل دینے سے مراد پیٹرول کی کثرت وغیرہ ہے۔ ذیل میں وہ شرعی ضوابط بیان کیے جاتے ہیں جنہیں علامت قیامت کی تفسیر و تطبیق کے وقت ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیے۔

پہلا ضابطہ: قیامت کب قائم ہوگی اس کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے پاس ہے۔
قرآن وسنت کی نصوصِ کثیرہ اس امر پر دلالت کرتی ہیں۔ جن میں سے چند ایک کی جھلک یہاں

ملاحظہ فرمائیں:

فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (الاعراف:187)

ترجمہ: ''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کب قائم ہوگی؟ آپ ان سے کہیے: ''یہ بات تو میرا پروردگار ہی جانتا ہے۔ وہی اسے اس کے وقت پر ظاہر کرے گا اور یہ آسمانوں اور زمین کا بڑا بھاری حادثہ ہوگا جو یکدم تم پر آن پڑے گا۔ لوگ آپ سے تو یوں پوچھتے ہیں جیسے آپ ہر وقت اس کی ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں۔ ان سے کہئے کہ اس کا علم اللہ ہی کو ہے مگر اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے''۔

لہٰذا جن نظریات کے تحت بھی دنیا کی عمریں مقرر کی گئی ہیں کہ کسی نے کہا کہ دنیا کی عمر نبی ﷺ کے بعد پندرہ سو سال ہے، اور ایک مایہ تہذیب[1] کی دنیا کے خاتمے کے نظریہ کی رسوائی تو 2012 میں پوری دنیا نے دیکھی جن کا خیال تھا کہ 21 دسمبر 2012 کو مایہ تہذیب کا کلینڈر ختم ہوتے ہی دنیا ختم ہوجائے گی۔ اسی طرح آج کی سائنس کی رو سے کچھ نظریات پیش کرکے دنیا کے خاتمے کا اندازہ لگایا جاتا ہے اس حوالے سے چند دن قبل ایک اہم خبر جسے عالمی میڈیا نے کوریج دی جس میں عیسائی راہبوں کے کچھ حلقوں نے دعویٰ کیا کہ 23 ستمبر 2017ء کو دنیا تباہ ہوجائے گی۔ ایک عیسائی ریسرچر ڈیوڈ میڈی نے دعویٰ کیا کہ انجیل میں دی گئی باتوں اور ہندسوں کے کوڈز کے حوالے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں 33 کا ہندسہ نمایاں ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام 33 سال

---

[1] مایہ ایک فرقہ اور تہذیب ہے جن کا کہنا ہے کہ ان کا کلینڈر ختم ہوتے ہی دنیا کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اور اس تہذیب کا کلینڈر 21 دسمبر 2012 کو ختم ہوگیا لیکن دنیا کی اینٹ بھی نہیں ہلی۔ مایا کلینڈر کا آغاز 5125 سال قبل ہوا تھا۔ اس عقیدے کے ماننے والوں کی اکثریت میکسیکو میں آباد ہے۔ دنیا میں اس عقیدے کے ماننے والے لوگوں نے جب دیکھا تھا کہ ان کے کلینڈر کے خاتمے کی تاریخ آرہی ہے تو یورپ میں کئی لوگوں نے قیامت سے بچنے کے لیے محفوظ مقامات کی جانب سفر شروع کردیا تھا۔

زندہ رہے، انجیل میں خدا کا ذکر 33 بار آیا، اکیس اگست کو مکمل سورج گرہن کے 33 دن بعد یعنی 23 ستمبر کو دنیا کو تباہ ہونا ہے''[1] لیکن یہ 23 ستمبر بھی گذر گیا۔ یہ سب بے بنیاد، جھوٹ اور فریب پر مبنی باتیں اور نظریات ہیں۔ کسی بھی مسلمان کیلئے جائز نہیں کہ ان نظریات کی تصدیق کرے یا اس پر تائیدی بحث ومباحثہ کرے۔ ایسا کرنے سے قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصوص کثیرہ پر قائم ایمان کی دیوار زمین بوس ہوجائے گی۔

اس طرح کے جھوٹ پر مبنی بھونڈے دعوے اس سے قبل بھی بیشتر بار کئے جا چکے ہیں۔

ایسے ہی نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف محدث، مفسر ومؤرخ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''لم يثبت في حديث عن النبي عليه الصلاة والسلام أنه حدد وقت الساعة بمدة محصورة، وإنما ذكر شيئًا من علاماتها وأشراطها وأمراتها".[2]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی ایک بھی حدیث میں یہ ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیامت کی کسی مدت کا تعین کیا ہو، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو محض اس کی چند علامات اور نشانیاں بیان کی ہیں''۔

مزید فرماتے ہیں: ''والذي في كتب الإسرائيلين، وأهل الكتاب من تحديد ما سلف بألوف ومئات من السنين، قد نص غير واحد من العلماء على تخطئتهم فيه، وتغليطهم".[3]

''ہاں جو باتیں اسرائیلیوں اور اہل کتاب کی کتابوں میں دنیا کی عمر کے تعین کے بارے میں ہیں کہ وہ ہزار ہا سال یا سینکڑوں سال ہے، تو اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد نے ان کے ان مفروضوں کو غلط اور بے بنیاد قرار دیا ہے''۔

لہٰذا اس ضابطے کی رو سے دنیا کی عمر کے تعین کے بارے قائم تمام مفروضوں اور نظریات کا انکار

---

[1] http//:urdu.dunyanews.tv/index.php/ur/world/406489

[2] النهاية في الفتن والملاحم: 6/1

[3] النهاية في الفتن والملاحم: 16/1

ایک مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔ اور جو بھی قیام قیامت کے وقت جاننے کا دعویٰ کرتا ہے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

(2) فرمان باری تعالیٰ ہے: ''﴿يَسْأَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا﴾ (الاحزاب:63)

ترجمہ: ''لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ ان سے کہئے کہ اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ اور آپ کو کیا خبر، شاید وہ قریب ہی آ پہنچی ہو''۔

(3) جناب جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے اور فرمایا:

''فأخبرني عن الساعة قال ما المسؤول عنها بأعلم من السائل قال فأخبرني عن أماراتها قال أن تلد الأمة ربتها وأن ترى الحفاة العراة العالة رعاء الشاة يتطاولون في البنيان قال ثم انطلق فلبثت مليا ثم قال لي يا عمر أتدري من السائل قلت اللهٰ ورسوله أعلم قال فإنه جبريل أتاكم يعلمكم دينكم"[1]

ترجمہ: ''مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے آپ (ﷺ) نے عرض کیا کہ قیامت کے بارے میں جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ اس بات سے واقف نہیں ہے (یعنی سوال کرنے والے اور جواب دینے والے دونوں کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے) اس نے عرض کیا اچھا قیامت کی علامات بتائیے رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا قیامت کی علامات میں سے یہ بات ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی اور تو دیکھے گا کہ ننگے پاؤں ننگے جسم تنگ دست چرواہے بڑی بڑی عمارتوں پر اترائیں گے اس کے بعد وہ آدمی چلا گیا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں کچھ دیر تک ٹھہرا رہا پھر رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا اے عمر کیا تم جانتے ہو کہ یہ سوال کرنے والا کون تھا میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں آپ

[1] صحیح المسلم:کتاب الایمان باب الاسلام ماهو؟ بیان خصاله حدیث :10

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ جبرائیل علیہ السلام تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے"۔

دوسرا ضابطہ: علامات قیامت کی تفسیر میں بردباری، تحمل، سے کام لیا جائے اور اس میں عجلت جلد بازی اور جذبات سے پرہیز کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانِ مبارک ہے: "التأني من الله، والعجلة من الشيطان"[1]

"بردباری وتحمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے"۔

لہٰذا علامات قیامت کی عجلت میں تفسیر کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اس معاملے کو اہل علم کی طرف لوٹایا جائے۔ قرآن مجید نے ہمیں اس حوالے سے بہت واضح ضابطہ دیا ہے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے: "﴿وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا﴾[النساء:83]

ترجمہ: "اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اس کو پیغمبر اور اپنے اولی الامر کے پاس پہنچا دیتے تو تحقیق کرنے والے اس کی تحقیق کر لیتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو چند اشخاص کے سوا سب شیطان کے پیرو ہو جاتے"۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ فتنے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " "تشتبه مقبلة وتبين مدبرة" [2]

"جب فتنہ آتا ہے تو اس کا امر مشتبہ ہوتا ہے (یعنی ہر کوئی اسے نہیں پہچان پاتا) مگر جب وہ چلا جاتا ہے تو اس کی خطورت وتباہی واضح ہو چکی ہوتی ہے"۔

---

[1] سنن الترمذي: 2012، حسنه الألباني السلسلة الصحيحة: 1795

[2] مصنف ابن أبي شيبة:38888

شمر رحمہ اللہ اس اثر کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس کا مطلب یہ ہے کہ فتنہ جب آتا ہے تو اس کا معاملہ لوگوں پر مشتبہ ہوجاتا ہے بہت سے لوگ اس میں مبتلا ہونے کے بعد بھی سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں حتی کہ وہ اس میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اور جب وہ تباہی پھیلا کر چلا جاتا ہے تو جو بھی اس میں مبتلا ہوا ہوتا ہے اس پر بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ غلطی پر تھا''۔

لیکن جب سب تباہ ہوگیا تو پھر پچھتانے کا اور اعترافِ جرم کا کیا فائدہ۔

اب پچھتائے کیا ہوت   جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

سلف کی علاماتِ قیامت کی تفسیر میں احتیاط اس مثال سے بخوبی واضح ہوجاتی ہے: حفص بن غیاث رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "قلت: لسفيان الثوري يا أبا عبد الله إن الناس قد أكثروا في المهدي۔قال: "إن مر على بابك المهدي فلا تكن منه في شيء حتى يجتمع الناس عليه". [1]

ترجمہ: ''میں نے سفیان ثوری سے کہا کہ اے ابا عبداللہ لوگوں نے امام مہدی سے متعلق بہت سی باتیں کی ہیں (یعنی ہر کوئی کہتا ہے کہ مہدی فلاں ہے فلاں ہے آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟) سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اگر مہدی کا گذر آپ کے دروازے کے سامنے سے بھی ہوجائے تو تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے جب تک کہ تمام لوگ اس پر جمع نہ ہوجائیں'' (یعنی جب تک سب لوگ اس کی بیعت نہ کرلیں تم اس معاملے میں جلدی نہ کرنا احتیاط کا دامن تھامے رہنا)۔

لہذا جب بھی کوئی ایسا فتنہ یا علامت نظر آئے جس سے محسوس ہوتا ہو کہ شاید یہ وہی علامت نہ ہو جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حدیث میں ہمیں خبر دی ہے تو اس معاملہ میں انتہائی محتاط رہنا چاہئے یہاں تک کہ تمام علامات مکمل طور پر ظاہر نہ ہوجائیں۔ اور اس طرح کے معاملات

---

[1] سير اعلام النبلاء للذهبی،الطبقة السادسه ، ترجمة سفيان الثوری رحمه الله

میں اپنے اجتہاد و قیاس کے بجائے علمائے ربانیین کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

تیسرا ضابطہ: علامات قیامت میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کا تعلق تسلسل زمانہ کے ساتھ ہے۔یعنی اللہ کے رسول ﷺ نے ان حادثات کو بالترتیب ذکر فرمایا ہے ہمیں بھی اس ترتیب زمنی ہی کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

اس ضابطے کا مفہوم یہ ہے کہ علامات قیامت دو طرح کی ہیں ایک وہ جن کی شریعت نے ترتیب متعین کی ہے کہ پہلے یہ ہوگا پھر یہ ہوگا اور پھر یہ ہوگا۔اور دوسری قسم وہ ہے جو مطلق بیان کی گئی علامات ہیں ان میں زمانہ کی ترتیب کا کوئی ذکر نہیں۔لہٰذا جب بھی علاماتِ قیامت کی تفسیر و توضیح کی جائے تو اس تقسیم کو ملحوظ رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ یہ کون سے علامات میں سے ہے۔آیا ان میں سے جو ترتیب وار مذکور ہیں یا یہ مطلق علامت ہے۔

اگرچہ اہل علم کے مابین قیامت کی بڑی علامات کی ترتیب کے بیان میں اختلاف ہے جمہور اہل علم نے یہ ترتیب یوں بیان فرمائی ہے۔(1) **چھوٹی علامات کا ظہور** جن میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت، طاعون عمواس، مساجد کا سجایا جانا، عمارتوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا، امانت کا اٹھ جانا، جہالت عام ہونا، شرک کا ظہور، سنتوں میں لاپرواہی کرنا، فحاشی اور آلات موسیقی کا عام ہونا، زلزلوں کی کثرت، بارشوں کا زیادہ ہونا اور اناج کا کم ہوجانا، اچانک موت واقع ہوجانا، جھوٹی گواہی کا عام ہوجانا، قتل عام کا بڑھ جانا، کنجوسی کا عام ہونا، لوگوں کا کثرت سے موت کی تمنا کرنا، رومیوں کا بڑھ جانا اور ان سے مسلمانوں کی کثرت سے لڑائیاں، شراب نوشی عام ہونا وغیرہ وغیرہ۔(2) **امام مہدی کا ظہور**۔ان کا ظہور ظہورِ دجال اور نزول مسیح علیہ السلام سے قبل ہوگا۔اس کی دلیل سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: " ینزل عیسی بن مریم فیقول

أميرهم المهدي تعال صل بنا ، فيقول : لا إن بعضكم أمير بعض تكرمة الله لهذه الأمة"[1]

ترجمہ: ''عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو مسلمانوں کے امیر امام مہدی فرمائیں گے کہ آئیں نماز کی امامت کرائیں۔ تو عیسی علیہ السلام فرمائیں گے نہیں تم ایک دوسرے کے امیر ہو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اس اکرام اور اعزاز سے نوازا ہے''۔

لہٰذا روایات کی رو سے عیسیٰ علیہ السلام امام مہدی کی امامت میں نماز ادا کریں گے۔

(3) **دجال کا نکلنا** (4) **عیسیٰ علیہ السلام کا نزول**۔ آپ نازل ہو کر دجال کو قتل کریں گے۔

(5) **یاجوج ماجوج کا نکلنا**۔ یاجوج ماجوج کا ظہور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہوگا۔ اس کی دلیل نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا: ان النبي صلى الله عليه وسلم حدثهم حديثا عن الدجال وقال فيه :" فبينما هو كذلك إذ أوحى الله إلى عيسى إني قد أخرجت عبادا لي لا يدان لأحد بقتالهم فحرز عبادي إلى الطور ، ويبعث الله يأجوج ومأجوج وهم من كل حدب ينسلون ، فيمر أوائلهم على بحيرة طبرية فيشربون ما فيها ويمر آخرهم فيقولون لقد كان بهذه مرة ماء "[2]

ترجمہ ''پس اسی دوران جناب عیسی علیہ السلام پر اللہ رب العزت وحی نازل فرمائیں گے کہ تحقیق میں نے اپنے ایسے بندوں کو نکالا ہے کہ کسی کو ان کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں۔ پس آپ میرے بندوں کو حفاظت کے لئے طور کی طرف لے جائیں اور اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو بھیجے گا اور وہ ہر اونچائی سے نکل پڑیں گے، ان کی اگلی جماعتیں بحیرہ طبری پر سے گزریں گی اور اس کا سارا پانی پی جائیں گے اور ان کی آخری جماعتیں گزریں گی تو کہیں گی کہ اس جگہ کسی وقت پانی موجود تھا''۔

[1] المنار المنيف لابن القيم (147/1) إسناده جيّد . وأصله في صحيح مسلم بدون تسمية الأمير

[2] صحيح مسلم :حديث (2937)

اس کے بعد دیگر علامات ظاہر ہوں گی جن میں سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ جانور کا زمین سے نکلنا، وغیرہ شامل ہے۔

چوتھا ضابطہ: کئی علامات قیامت ایسی بھی ہیں جو روایات کے عین مطابق واقع ہو چکی ہیں اور کچھ جاری بھی ہیں لہذا کسی مسلمان کیلئے یہ جائز نہیں وہ تاویل کرتے ہوئے کہے کہ نہیں یہ تو وہ زمانہ نہیں جس کے بارے میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس میں ایسا ہوگا ایسا ہوگا۔ بلکہ یہ زمانہ ابھی آئے گا۔ جیسے زنا، شراب نوشی، گانے بجانے، جہالت کا عام ہونا ہے۔ وہ اس کے عام ہونے کا بھی انکار کرتا رہے۔ یہ وطیرہ منہج سلف کے خلاف ہے بلکہ جو عام علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں ان کے ظہور کا اعتراف کرنا چاہیے۔

پانچواں ضابطہ: علامات قیامت سے متعلق محض صحیح احادیث پر اعتماد کرنا چاہئے نا کہ ضعیف اور موضوع روایات پر۔

چھٹا ضابطہ: علامات قیامت کے باب میں وارد روایات حقیقی معنیٰ و مفہوم پر مبنی ہیں نہ کہ مجازی معنیٰ پر۔ لہذا قیامت سے پہلے پیش آنے والے حالات وواقعات سے متعلقہ نبوی پیش گوئیوں میں من مانی تاویلات کرنا درست نہیں۔ بلکہ انہیں من وعن قبول کرنا اور ظاہری معنیٰ پر ہی محمول کرنا منہج سلف ہے۔

’’چنانچہ اگر احادیث میں دجال یا امام مہدی کے ظہور کا ذکر ملتا ہے تو ان سے حقیقی طور پر یہ شخصیات ہی مراد ہیں کوئی قوم، قوت وطاقت یا کوئی بھی مجدد یا عادل ومنصف حکمران نہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات نے دجال کی تاویل کرتے ہوئے اس سے امریکہ اور اسرائیل مراد لیا ہے، اسی طرح دجال کے ماتھے پر لکھے ہوئے ’’ک، ف، ر‘‘ سے اسرائیل کا K-F-R جنگی طیارہ مراد لیا ہے اور کچھ نے دجال کی پیش گوئی سے ہر وہ طاقت مراد لی ہے جو دجل وفریب میں حد درجہ بڑھ کر ہو اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔اسی طرح امام مہدی کی پیش گوئی کا انطباق کچھ حضرات ہر عادل ومنصف حکمران پر کرتے ہیں، جبکہ بعض نے ہر تجدید دین کا کام کرنے والے پر اس کا انطباق کیا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امام مہدی سے بھی ایک خاص شخصیت مراد ہے جس کی چند علامات صحیح احادیث میں موجود ہیں، اس کا خاص نام مذکور ہے، اس کے والد کا نام مذکور ہے، اس کی نسل کی وضاحت ہے۔تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس سے ہر مجدد مراد لے لیا جائے؟

بعض احادیث میں یہ پیش گوئی مذکور ہے کہ قیامت سے پہلے دریائے فرات سے سونے کا پہاڑ ظاہر ہوگا۔تو اب پہاڑ سے مراد پہاڑ ہی لیا جائے گا اور ان الفاظ کو حقیقت پر ہی محمول کیا جائے گا کیونکہ جیسے اللہ تعالیٰ کانوں میں سونا پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح کسی دریا یا سمندر سے بھی ایسا خزانہ ظاہر فرما سکتے ہیں۔لیکن بعض حضرات نے یہاں بھی تاویل سے کام لیا اور کہا کہ سونے کے پہاڑ سے مراد پٹرول ہے۔ حالانکہ اگر اس موضوع سے متعلقہ تمام احادیث کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پہاڑ کا ظہور مسلمانوں کے لیے ایک فتنہ ہوگا جبکہ اہل عرب پٹرول کو بطورِ نعمت استعمال کر رہے ہیں، حدیث کے مطابق یہ پہاڑ دریائے فرات کے ساتھ ہی خاص ہوگا جبکہ پٹرول تو ہر دریا، سمندر بلکہ خشکی سے بھی نکالا جا رہا ہے۔ پھر فرمانِ نبوی کے مطابق اس خزانے پر بہت بڑی جنگ ہوگی جس میں 99 فیصد لوگ قتل ہو جائیں گے جبکہ پٹرول ظاہر ہوئے ایک عرصہ ہوا لیکن کبھی کسی نے اس مقام پر اتنی بڑی جنگ نہیں دیکھی۔ بہرحال یہ تاویل بھی درست نہیں اور اس کی تردید کے اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے یہودیوں کے خلاف جنگ میں پتھر اور درخت پکار پکار کر یہودیوں کی نشاندہی کریں گے تو اس پر بھی تمام مسلمانوں کا ایمان ہونا چاہیے کہ گو پتھر اور درخت قوتِ گویائی نہیں رکھتے لیکن قیامت کے قریب اللہ کے حکم سے یہ بھی کلام کریں گے۔ اسی طرح احادیث میں ذکر ہے کہ قبل از قیامت زمین سے ایک جانور ''دابۃ الارض'' نکلے گا اور لوگوں سے کلام کرے گا تو اس سے بھی بلا تاویل وہ خاص جانور ہی مراد لیا جائے گا۔ اسی طرح کچھ نبوی پیش گوئیوں میں خاص علاقہ جات کا بھی ذکر ہے جیسا کہ قسطنطنیہ کی طرف پیش قدمی کرنے والا پہلا اسلامی

لشکر جنتی ہے اور مکہ ومدینہ میں دجال داخل نہیں ہوسکے گا وغیرہ وغیرہ تو اس طرح کی پیش گوئیوں میں بھی وہی مخصوص علاقے مراد ہوں گے۔[1]

نوٹ: اس مضمون کی تیار میں مندرجہ ذیل مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(1)القرآن الكريم

(2)كتب حديث

(3)فقه اشراط الساعة تاليف محمد اسماعيل المقدّم

(4)موقف أهل السنة والجماعة من تنزيل نصوص الفتن وأشراط الساعة على الحوادث " السفياني أُنموذجاً " تاليف : زاهر بن محمد بن سعيد الشهري

(5)ضوابط شرعية فی فهم اشراط الساعة ۔ازمحمد صالح المنجد

(6)تنزيل نصوص الفتن وأشراط الساعة على الواقع المعاصر مقاله : ڈاکٹر عبدالله بن حمود الفريح

(7)آئینہ پرویزیت از مولانا عبد الرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ

(8)دجال اور علاماتِ قیامت کی کتاب از حافظ عمران ایوب لاہوری

(9)اشراط الساعة تاليف يوسف الوابل

وصلى الله على نبيّنا محمد صلى الله عليه وسلم



[1] دجال اور علامات قیامت کی کتاب از حافظ عمران ایوب لاہوری صفحہ 18،19

سود کے احکام

آج کے حالات میں کیسے لاگو ہو سکتے ہیں؟

حافظ صلاح الدین یوسف [1]

شرعی عدالت کے ریٹائرڈ چیف جسٹس کے ریمارکس انسداد سود کی کوششوں کی ناکامی کی المناک کہانی

10 اپریل 2017 کی اخبارات میں وفاقی شرعی عدالت کے موجودہ چیف جسٹس جناب ریاض احمد خاں کے یہ ریمارکس شائع ہوئے ہیں کہ

''سود کی ممانعت کے وقت کی معیشت اور آج کی معیشت میں فرق ہے۔ اس وقت کے نظام کو آج کے وقت میں کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے؟''۔

موصوف نے یہ ریمارکس ملک بھر میں سودی نظام کے خاتمے سے متعلق شرعی عدالت میں کیس کی سماعت کے دوران میں دیئے۔

اس مقدمے کی سماعت چار رکنی بنچ نے کی، اس موقع پر چیف جسٹس نے یہ بھی کہا کہ ''ربا، سود اور انٹرسٹ تین مختلف لفظ ہیں۔ کیا یہ تینوں ہم معنیٰ ہیں یا ان میں فرق ہے؟ اس سوال سے موصوف کا مقصد ان تینوں الفاظ کا مفہوم و معنی ایک دوسرے سے مختلف باور کرانا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر کہ ''موجودہ دور میں

[1] مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان، نگران شعبہ تحقیق وتصنیف المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

انٹرسٹ کی تعریف سود نہیں بلکہ نقصان کا ازالہ ہے‘‘۔اس کی طرف واضح اشارہ بھی فرمادیا۔ یہ وہ مختصر تفصیل ہے جو اس مقدمے کی اخبارات میں شائع ہوئی ہے، اس سماعت کے بعد اس کی سماعت غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کردی گئی ہے۔

یہ مقدمہ کیا ہے؟

اس سے قبل کہ ہم اس مقدمے کی ابتدائی سماعت کے وقت محترم چیف جسٹس صاحب کے ریمارکس پر کچھ عرض کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم قارئین کو یہ بتلائیں کہ یہ مقدمہ ہے کیا؟

اس مقدمے کا پس منظراور اس کی ضروری روداد بیان کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر حکومت کی وہ بدنیتی یا عدم دلچسپی واضح نہیں ہوسکتی جو پاکستانی حکومت خاتمۂ سود کے لیے اپنی آئینی اور شرعی ذمہ داری کی ادئیگی میں مسلسل پہلوتہی اختیار کرتی آرہی ہے اور اس کی یہ کوتاہی تاحال جاری ہے۔

حکومت کی یہ آئینی اور شرعی ذمہ داری کیوں ہے؟

سود کا خاتمہ، حکومت کی آئینی ذمہ داری اس لیے ہے کہ پاکستان کے تینوں آئینوں میں، پہلے آئین 1956ء، دوسرے ایوب خان کے آئین 1962ء، اور تیسرے آئین 1973ء میں اس بات کی ضمانت دی گئی اور اس بات کا عزم ظاہر کیا گیا تھا کہ حکومت پاکستان نظام معیشت سے سود کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرے گی، حکومت جس قدر جلد ممکن ہوسکے، ربا کو ختم کرے گی۔

شرعی ذمہ داری یہ ہے کہ قرآن کریم میں سودی نظام پر اصرار اور تسلسل کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ قرار دیا گیا ہے۔ بنابریں کسی بھی مسلمان حکمران کے لیے انسداد سود کی کوششوں سے بے اعتنائی کا کوئی جواز نہیں ہے۔

غفلت اور بے اعتنائی کی المناک روداد

1962ء کے آئین کی رو سے قومی سطح پر ’’اسلامی نظریاتی کونسل‘‘ کے نام سے ایک دستوری ادارہ قائم کیا گیا جس میں تمام مسالک سے تعلق رکھنے والے مستند علمائے کرام کو نمائندگی دی گئی۔ اس ادارے کے منصبی

فرائض میں یہ بات شامل کی گئی کہ یہ ادارہ ایسی تجاویز مرتب کرے گا جن پر عمل کر کے پاکستان کے عوام کی زندگیوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جا سکے۔ چنانچہ 3 دسمبر 1969ء کو اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی آئینی ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے ایک رپورٹ تیار کی جس میں اتفاق رائے سے اس امر کا اظہار کیا گیا کہ

''ربا اپنی ہر صورت میں حرام ہے اور شرح سود کی کمی بیشی سود کی حرمت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہ موجودہ بینکاری نظام کے تحت افراد، اداروں اور حکومتوں کے درمیان قرضوں اور کاروباری لین دین میں اصل رقم پر جو اضافہ یا بڑھوتری لی یا دی جاتی ہے، وہ ربا کی تعریف میں آتی ہے۔ سیونگ سرٹیفکیٹس میں جو اضافہ دیا جاتا ہے، وہ بھی ربا میں شامل ہے اور اس کے ساتھ صوبوں، مقامی اداروں اور سرکاری ملازمین کو دیئے گئے قرضوں پر اضافہ بھی سود ہی کی ایک قسم ہے۔ لہذا یہ تمام صورتیں حرام ہیں اور ممنوع ہیں''۔

نظریاتی کونسل کی یہ سفارشات سودی نظام کے خاتمے کے لیے نہایت جامع تھیں اور ایک آئینی ادارہ ہونے کے اعتبار سے یہ ضروری تھا کہ ان سفارشات کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جاتا اور اس کے مطابق انسداد سود کے لیے مناسب قانون سازی کی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

کونسل کی مرتب کردہ اس رپورٹ کے 8 سال بعد 1977ء میں صدر جنرل ضیاء الحق نے کونسل کو ہدایت کی کہ وہ ضروری تحقیق اور تفتیش کے بعد ایسے طریقے بھی تجویز کرے کہ جن کو اپنا کر سود جیسی لعنت کا خاتمہ کیا جا سکے۔

حالانکہ اصولی طور پر یہ کام پارلیمنٹ کا تھا، کونسل نے تو نہایت جامع انداز سے ایک رپورٹ مرتب کر کے ساری صورت حال واضح کر دی تھی۔ بہر حال کونسل نے مزید اتمام حجت کے لیے بینک کے ماہرین، اقتصادیات کے ماہرین اور علماء سے طویل گفتگو اور بحث و مباحثہ کے بعد 25 جون 1980ء کو اپنی رپورٹ صدر ضیاء الحق کے سامنے پیش کر دی۔ اس رپورٹ میں سود کو ختم کر کے اس کے متبادل نظام کی جملہ تفصیلات درج تھیں اور کہا گیا کہ ان تجاویز پر عمل درآمد سے دو سال کے اندر اندر پاکستان کی معیشت سود سے مکمل پاک ہو سکتی ہے لیکن حکومت اور اس پر مسلط کردہ بیوروکریسی نے صدق دلانہ طور پر کونسل کے بتلائے ہوئے طریقہ کار کو اختیار نہیں کیا، البتہ اپنے طور پر کچھ ایسے نیم دلانہ اقدامات کیے جس سے یہ تاثر یا مغالطہ دیا

جا سکے کہ حکومت نے اس کام کا آغاز کر دیا۔اور یہ اقدامات وہی تھے جو بینکوں میں غیر سودی کھاتوں کے نام سے بھی ایک ایک شعبہ کھول دیا گیا۔اول تو یہ سودی کھاتوں کے ساتھ ساتھ ایک غیر سودی کھاتے کا نظام بھی،سودی نظام کے خاتمے کے لیے متبادل نظام نہیں تھا۔دوسرے غیر ضروری کھاتے میں نئی اصطلاحات متعارف کرائی گئیں،مثلاً مضاربہ،مشارکہ،مرابحہ اور بیع موجل وغیرہ۔یہ اصطلاحات بظاہر شرعی اور فقہی تھیں جس سے یہ تاثر دیا گیا کہ سودی صورتوں کے مقابلے میں غیر سودی طریقے اختیار کر لیے گئے ہیں،تاہم حقیقت اس کے برعکس تھی،یہ صرف ناموں اور اصطلاحات کا ہیر پھیر تھا اور ان کھاتوں کے اندر بھی سودی روح ہی کارفرما تھی۔چنانچہ نظریاتی کونسل نے،جس نے بڑی محنت سے سود سے بچاؤ کے طریقے تجویز کر کے حکومت کو دیئے تھے،صورتحال کو دیکھتے ہوئے کہ بقول فیض ؎

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا،یہ وہ سحر تو نہیں

ایک نئی رپورٹ تیار کی گئی جس میں اپنی رپورٹ کی پامالی اور ناقدری پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا گیا:

کونسل نے 81-1980ء میں کیے جانے والے ان اقدامات کا جائزہ لیا جو حکومت نے اسلامی نظام معیشت کے نفاذ کے سلسلے میں انجام دیے ہیں۔ان میں خاتمۂ سود کے لیے کیے جانے والے اقدامات ان سفارشات کے بالکل برعکس ہیں جو کونسل نے تجویز کیے۔۔۔حکومت نے وہ طریق استعمال کیا کو مقصد کو فوت کرنے کا سبب بن گیا ہے"۔

اس وقت کے بعض ممبران کونسل نے راقم کو بتلایا کہ جب صدر جنرل ضیاء الحق صاحب کے سامنے بعض حضرات نے شکوہ کیا تو موصوف نے کہا کہ وہ کوششیں کریں گے کہ بینکاروں اور سودی خاتمے کی رپورٹ تیار کرنے والوں کی باہم ملاقات کروائیں تاکہ باہم تبادلہ خیالات سے کوئی بہتر صورت نکل سکے لیکن مرحوم صدر کی طرف سے اس تجویز پر عمل درآمد کی کوئی صورت سامنے نہیں آئی۔اور سودی نظام اپنی جدید اور قدیم صورتوں کے ساتھ جاری وساری رہا۔اور کونسل کی ساری محنت بھی رائیگاں ہی گئی۔۔۔ ؎

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

عدالت کے ذریعے دوسری کوشش اور حکومت کی وہی ''نہ مانوں'' کی پالیسی

1990ء میں ایک شخص محمود الرحمٰن فیصل نے وفاقی شرعی عدالت میں ایک درخواست دی کہ رائج الوقت سودی نظام معیشت کو غیر اسلامی قرار دے کر اس پر پابندی عائد کی جائے اور حکومت کو ہدایت کی جائے کہ پاکستان کے معاشی نظام سے سود جیسی لعنت کا خاتمہ کیا جائے۔ عدالت نے اس کیس سے ملتے جلتے 114 دیگر کیسوں کی مشترکہ سماعت کی۔ اس مقدمے میں شرعی عدالت نے بینکاروں، ماہرین اقتصادیات، حکومتی نمائندں اور علماء کو تفصیلی طور پر سنا اور موضوع سے متعلقہ تمام اہم مباحث کو زیر غور لایا گیا اور تحریری اور زبانی بیانات حاصل کیے اور اکتوبر 1991ء میں 157 صفحات پر مشتمل اپنا تاریخی فیصلہ سنایا۔ فیصلہ کرنے والے اس میں جسٹس تنزیل الرحمٰن بطور چیف جسٹس، جسٹس فدا محمد خان اور جسٹس عبید اللہ خاں شامل تھے۔

شرعی عدالت نے اپنے فیصلے میں نہ صرف یہ کہ سود کہ ایسی تعریف متعین کی جسے معیار بنا کر مروجہ نظام معیشت میں پائے جانے والے سودی معاملات اور آئین اور دستور میں مذکور سودی دفعات کا جائزہ لیا جاسکتا تھا بلکہ رائج تمام سودی قوانین (22 قوانین) کا جائزہ لے کر بینکنگ سمیت تمام سودی لین دین کو حرام قرار دیا اور وفاقی حکومت اور تمام صوبوں سے بھی کہا کہ وہ 30 جون 1992ء تک متعلقہ قوانین میں تبدیلی کریں اور یہ بھی کہا کہ یکم جولائی 1992ء سے تمام سودی قوانین غیر آئینی ہوجائیں گے اور تمام سودی کاروبار غیر اسلامی ہونے کی بنا پر ممنوع قرار پائے گا۔

یہ تاریخ ساز فیصلہ دستور اور آئین کے تقاضوں کے مطابق بھی تھا اور عوام کی خواہشات کے مطابق بھی۔ اس لیے اس فیصلے کو ہر سطح پر سراہا گیا اور عوام کی امنگوں کا مظہر قرار دیا گیا۔ لیکن ظاہر بات کہ حکومت جو اندرونی اور بیرونی قرضوں میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے اور اس سے نکلنے کی آرزو اور خواہش بھی نہیں رکھتی، علاوہ ازیں اس ظالمانہ نظام سے اس کے اور اسی کے حوالی موالیوں کے بہت سے مفادات بھی وابستہ ہیں، اس کے لیے یہ فیصلہ قطعاً نا قابل قبول تھا اور اس نے حیلہ پرویزی کے ذریعے سے اس کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔

چنانچہ 30 جون 1992ء کے آنے سے پہلے پہلے مالیاتی اداروں، بینکوں اور بعض افراد نے سپریم

کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بینچ میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیلیں دائر کر دیں۔ یہ اپیلیں شرعی عدالت کے فیصلے کے نفاذ میں بڑی رکاوٹ بن گئیں۔ چنانچہ حکومت اپنی اس سازش میں کامیاب رہی اور سات سال تک یہ اپیلیں شریعت اپیلیٹ بینچ کے سرد خانے میں پڑی رہیں۔ بالآخر 1999ء کے اوائل میں سپریم کورٹ میں ایک شریعت اپیلیٹ بینچ تشکیل دیا گیا۔ اس بینچ نے کئی ماہ تک مسلسل ان اپیلوں کی سماعت کی۔

اس پانچ رکنی بینچ میں جسٹس خلیل الرحمٰن صاحب، (بطور چیئر مین) جسٹس وجیہہ الدین صاحب، جسٹس منیر اے شیخ، جسٹس مفتی مولانا تقی عثمانی صاحب اور جسٹس ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب شامل تھے۔

معزز عدالت نے سماعت کے دوران مقدمہ میں زیر بحث آنے والے اہم فقہی مباحث، معاشی معاشرتی، قانونی اور آئینی معاملات (ایشوز) پر رہنمائی حاصل کرنے کے لیے فریقین کے وکلاء حضرات کے علاوہ ماہرین علم وفن سے بھی اپیل کی کہ وہ زیر بحث مسئلے کے حوالے سے عدالت کی معاونت کریں۔ اس سلسلے میں بینچ نے دس سوالات بھی مرتب کر کے مختلف علماء کو بھیجے، راقم نے بھی ان سوالات کا جواب لکھ کر عدالت عظمیٰ کو ارسال کیا تھا، راقم کے یہ جوابات مضمون کے آخر میں قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔ صوبہ خیبر پختون خواہ کے مولانا گوہر رحمٰن مرحوم نے بھی ان سوالات کے جواب تحریر فرمائے تھے۔ یہ دس سوال نہایت اہمیت کے حامل تھے جس سے مسئلہ زیر بحث کے اہم گوشے واضح ہوجاتے ہیں اور صحیح رہنمائی بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان کے علاوہ اسلامی دنیا کے متعدد نامور محققین اور قانون دان حضرات نے فاضل عدالت کی رہنمائی کرتے ہوئے اپنی آراء اور تجاویز سے تحریری طور پر اور زبانی بھی مستفید کیا اور جدید وقدیم معاشی کتب وجرائد کے علمی ذخیرے سے اہم اقتباسات کی نقول عدالت کے روبرو پیش کیں۔

اس سارے مواد کی چھان پھٹک اور علماء وکلاء کی بحثوں کی سماعت کرنے کے بعد سپریم کورٹ کے مذکورہ بینچ نے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو عمومی طور پر درست قرار دیتے ہوئے جدید بینکاری سمیت تمام دیگر سودی قوانین کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ممنوع اور حرام قرار دے دیا اور حکومت کو مزید مہلت دیتے ہوئے ہدایت جاری کی کہ وہ جون 2001ء تک تمام غیر اسلامی قوانین کو نئے قوانین سے بدل کر بینکنگ اور دیگر معاشی معاملات کو سود پاک کر دے۔

وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے بعد، جو اکتوبر 1991ء میں منظر عام پر آیا تھا، یہ دوسرا نہایت اہم فیصلہ تھا جو آٹھ سال کے بعد سامنے آیا۔ دونوں موقعوں پر علماء اور صحیح الفکر وکلاء کی طرف سے بھرپور دلائل پیش کیے گئے اور فاضل عدالت کی طرف سے کیے گئے سوالات کے مدلل جوابات دیئے گئے جن سے مزید بہت سے پہلو منقح اور واضح ہوئے اور پہلے مقدمے کی طرح اس دوسرے مقدمے میں بھی فاضل عدالت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ وہ سود کی ممانعت کا قطعی فیصلہ صادر کر دے۔

حکومت کی بدنیتی اور گریز پائی

لیکن بدنیتی اور گریز پائی کا کسی کے پاس علاج نہیں ہے اور جب ایک فریق یہ تہیہ ہی کر لے کہ اس نے کسی صورت بھی موجودہ ظالمانہ نظام کو بدلنا نہیں ہے تو عدالتی فیصلے اس کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں جبکہ یہ فریق ہمہ مقتدر بھی ہے۔

چنانچہ اس دوسرے نہایت اہم فیصلے کے بعد اس کو بھی تارپیڈو کرنے کی سازش تیار کر لی گئی۔ اور جون 2001ء آنے سے پہلے پہلے حکومت نے ایک درخواست شریعت بینچ کے سامنے دائر کی جس میں یہ استدعا کی گئی کہ سودی نظام کو ختم کرنے کے لیے مزید دو سال کی مہلت دی جائے۔ عدالت نے اس درخواست کی بنیاد پر مزید ایک سال کی مہلت دیتے ہوئے کہا کہ وہ جون 2002ء تک مطلوبہ آئینی و انتظامی اقدامات مکمل کر لے۔

اگر حکومت انسداد سود کے لیے عملی اقدامات کرنے کی خواہشمند ہوتی تو وہ یقیناً اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عملی اقدامات بروئے کار لانے کا اہتمام کرتی لیکن اس نے اس کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھایا بلکہ عدالت کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے کے قریب آئی تو ایک نجی بینک (UBL) کی جانب سے نظر ثانی کی ایک درخواست عدالت میں پیش کر دی گئی۔

انہی ایام میں یہ المیہ بھی ہوا یا عمداً ایسا کیا گیا کہ شریعت اپیلیٹ بینچ کے جن ارکان نے فیصلہ دیا تھا۔ ان میں سے چار جج فارغ کر دیے گئے اور صرف ایک جج جسٹس منیر اے شیخ باقی رہ گئے۔ اب نظر ثانی کی اپیل کی سماعت جس بینچ نے کرنی تھی وہ حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھی۔

جسٹس شیخ ریاض احمد (بطور چیئر مین) جسٹس قاضی محمد فاروق، جسٹس ڈاکٹر خالد محمود اور جسٹس رشید احمد جالندھری۔

آخر الذکر دو فاضل جج، جو علماء کی نشست پر براجمان کیے گئے تھے ان کا اسلامی کردار ہر دور میں محل نظر ہی رہا ہے، اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں، تاہم واقف الحال حضرات سے مخفی نہیں۔ بہر حال اس بینچ نے مقدمے کی از سر نوع سماعت کی اور وہ تمام مباحث جن پر پہلے تفصیلی بحث ہو چکی تھی اور وہ گویا طے شدہ تھے، دوبارہ زیر غور لائے گئے اور بینک کے وکلاء اور سرکاری وکلاء کو خلط مبحث کا پورا موقع دیا گیا تا کہ بحث کا وہ رخ، جو اس سے پہلے دو مقدموں میں واضح طور پر متعین ہو چکا تھا، اس کو غلط رخ پر موڑا جا سکے اور ڈور کے سلجھے ہوئے سرے کو الجھا دیا جائے کہ اس کا سرا ہاتھ ہی نہ آئے، یا صحیح رخ پر جاتی گاڑی کی پٹڑی بدل دی جائے تا کہ وہ پٹڑی سے ہی اتر جائے یا اپنی اصل منزل مقصود پر نہ پہنچ پائے۔

اگر چہ صحیح الفکر علماء اور وکلاء نے بھی عدالت کے سامنے اپنے دلائل پیش کیے۔ انہوں نے بالخصوص حسب ذیل امور پر زور دیا:

- موجودہ بینچ کی تشکیل آئین کے ضوابط کے مطابق نہیں۔
- نظر ثانی کے معاملے میں عدالت کے اختیار بہت محدود ہوتے ہیں۔
- جن قوانین، ضوابط اور حقائق کا جائزہ، فیصلہ دینے والی عدالت عظمیٰ تفصیل سے لے چکی ہو، انہیں نظر ثانی کی آڑ میں دوبارہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔
- مذکورہ فیصلہ کے مخالف وکلاء نے جن امور کو نظر ثانی کی بنیاد بنایا ہے۔ ان سب پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے اور تمام بحث کے بعد ہی سابقہ فیصلے صادر کیے گئے تھے۔
- یہ دلیل بھی پیش کی گئی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر جزوی عمل ہو چکا ہے، اب قانون اس پر نظر ثانی کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ پانچ نکتے جو اسلامی ذہن رکھنے والے وکلاء نے اٹھائے، نہایت اہمیت کے حامل تھے، اگر نظر ثانی کی اپیل ایک سازش نہیں ہوتی اور بینچ کی تشکیل میں بھی خفیہ مقاصد کارفرمانہ ہوتے تو ان نکتوں کی بنیاد پر نئی بحثوں کو کالعدم قرار دے کر اور سابقہ دو فیصلوں کے طے شدہ امور کو تسلیم کر کے بجا طور پر نظر ثانی کی اپیل کو نامنظور اور سابقہ فیصلوں کی بحالی کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا لیکن یہ سارا ڈرامہ رچایا ہی اس لیے گیا تھا کہ حکومت سود کے ظالمانہ نظام سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی نہیں چاہتی۔ چاہے فوجی حکومت ہو یا سویلین حکومت۔ دونوں ہی قسم کے حکمران اغیار کے کسے ہوئے شکنجے سے نکلنے کا کوئی عزم نہیں رکھتے۔

1991ء میں جب پہلا فیصلہ آیا تھا، نواز شریف وزارت عظمیٰ پر براجمان تھے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ تعطل کا شکار رہا، یہ دور بے نظیر کی وزات عظمیٰ کا تھا، 1999ء میں جب دوسرا فیصلہ آیا تو پرویز مشرف کی فوجی حکومت تھی۔

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

بہرحال چند دن کی سماعت کے بعد نظر ثانی کے لیے تشکیل کردہ بینچ نے انتہائی عجلت میں 24 جون 2002ء کو اپنا فیصلہ سناتے ہوئے شریعت اپیلیٹ بینچ کا فیصلہ منسوخ کر دیا اور مقدمے کو از سر نو سماعت کے لیے دوبارہ وفاقی شرعی عدالت میں بھیجنے کے احکامات صادر کر دیے اس طرح اس عدالت نے طویل کوششوں اور جاں گسل محنتوں پر پانی پھیر دیا اور انسداد سود کا یہ دوسرا فیصلہ بھی کالعدم قرار پا گیا۔

شرعی عدالت کا سرد خانہ

اب تیسری مرتبہ یہ کیس پھر شرعی عدالت کے سپرد ہو گیا۔ پہلا فیصلہ جو 1991ء میں شرعی عدالت کی طرف سے آیا تھا، جسے تسلیم نہیں کیا گیا۔ وہ 1999ء تک سپریم کورٹ کے سرد خانہ میں پڑا رہا، جب اس کی طرف سے دوسری مرتبہ فیصلہ آیا جس سے پہلے فیصلے ہی کی توثیق کی گئی تھی، اسے بھی نظر ثانی کے نام پر سبوتاژ

کر دیا گیا۔ اور اسے پھر شرعی عدالت میں بھیج دیا گیا۔ اس کیس کو پھر سرد خانے کی نذر کر دیا گیا۔ بالآخر بعض حضرات کی کوششوں سے 22 اکتوبر 2013ء سے اس مقدمے کی سماعت کا آغاز کیا گیا۔

پہلی سماعت کے بعد دوسری سماعت پر شرعی عدالت نے بتایا کہ ایک سوال نامہ تمام درخواست گزاروں، ماہرین قانون، علماء اور ماہرین اقتصادیات کو ارسال کیا جائے گا جس کی روشنی میں ڈیمانڈ کردہ اس کیس پر بحث کی جائے گی۔ چنانچہ 16 سوالوں پر مشتمل ایک سوال نامہ شرعی عدالت کی طرف سے بذریعہ مراسلہ واخباری اطلاعات بھیجا گیا اور کہا گیا کہ اس کا جواب تیار کر کے 5 نومبر تک شرعی عدالت کے رجسٹرار کو ارسال کیا جائے۔

یہ 14 سوالات بحث کو الجھانے ہی کا ایک حربہ تھا کیونکہ اس قسم کا ایک سوال نامہ جو دس سوالوں پر مشتمل تھا، سپریم کورٹ نے بھی مختلف علماء کو ارسال کیا تھا جس کا نہایت معقول اور مدلل جواب علماء نے دیا تھا۔ اس کے بعد اس قسم کے سوالات کی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان سوالات اور جوابات سے بحث کے نہایت اہم گوشے واضح ہو چکے تھے اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بینچ نے ان کی روشنی ہی میں اپنا فیصلہ صادر کیا تھا۔

بہر حال ان 14 سوالات کے جوابات بھی وفاقی شرعی عدالت کو بہت سے اہل علم نے ارسال کر دیے تھے لیکن اس کے باوجود شرعی عدالت میں یہ مقدمہ زیر بحث نہیں آسکا۔ اس دوران میں ایک دو مرتبہ بعض حضرات کی طرف سے کوششیں بھی کی گئیں لیکن ان میں کامیابی نہیں ہوئی۔

چوتھی مرتبہ شرعی عدالت میں اور ہوا کا رخ

اب اپریل 2017ء میں چوتھی مرتبہ وفاقی شرعی عدالت میں اس کیس کی سماعت شروع ہوئی اور پہلی سماعت کے بعد بحث غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے۔

معلوم نہیں اب اس کا دوبارہ آغاز کب ہوگا اور کس طرح ہوگا؟ ہوا کا رخ تو کسی خطرناک طوفان کی نشاندہی کر رہا ہے اور چیف جسٹس صاحب کے تیور اور سوالات کا انداز بھی اس کی غمازی کر رہا ہے۔ اللہ خیر کرے۔

اخباری رپورٹ میں چیف جسٹس صاحب کے جو ریمارکس شائع ہوئے ہیں، وہ کسی طرح بھی شرعی عدالت کے چیف جسٹس کے شایان شان نہیں ہے۔ ان میں ایک بات یہ کہی گئی کہ نزول قرآن کے وقت کی معیشت آج سے مختلف تھی، آج اس کو کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے؟

یہ بات تو وہ لوگ کہتے ہیں جو آج کے دور میں اسلام کو ناقابل عمل قرار دیتے ہیں اور ان کی دلیل بھی یہی ہوتی ہے کہ آج کا معاشرہ اور حالات اسلام کے ابتدائی بدوی معاشرے سے مختلف ہیں۔ اسلام کی تعلیمات آج کے معاشرے میں نافذ نہیں ہو سکتیں۔ کیا فاضل چیف جسٹس صاحب بھی یہی سمجھتے ہیں۔ ان کے بیان سے تو ان کا یہی موقف واضح ہو رہا ہے۔ اور یہ موقف اتنا کمزور، پھس پھسا اور بے بنیاد ہے جس سے پاکستان کا مقصد وجود ہی محل نظر قرار پاتا ہے اور آئین پاکستان میں جن دفعات میں قرآن وسنت کے نفاذ اور حکومت کو ان کا پابند بنایا گیا ہے وہ بھی بے مقصد اور محض نمائشی قرار پاتی ہیں۔ کیا یہ تاثر صحیح ہوگا؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر شرعی عدالت کے قیام کا بھی کیا جواز ہے؟

دوسری بات فاضل موصوف نے یہ فرمائی کہ ربا، سود اور انٹرسٹ کی تعریف ہی متعین نہیں ہے، اس لیے پہلے ان کا معنی ومفہوم متعین ہونا چاہئے۔ حالانکہ پہلے دو فیصلوں میں ان الفاظ کے معنی ومفہوم اور مصداق پر مفصل بحثیں ہو چکی ہیں جن میں یہ طے پا چکا ہے کہ اس کا مصداق ایک ہی ہے اور وہ ربا کی وہ صورت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حرام قرار دیا ہے۔

ربا عربی زبان کا لفظ ہے اس کا ترجمہ متبادل لفظ فارسی میں سود ہے اور اردو میں بھی یہی لفظ ربا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، انٹرسٹ انگریزی زبان کا لفظ ہے جو ربا کے ہم معنی ہی ہے، ایک لفظ کے مختلف زبانوں کے اعتبار

سے الگ الگ الفاظ ایک دوسرے سے ہم معنی و مفہوم کے اعتبار سے مختلف تو نہیں ہوتے، سب کا مفہوم و مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔

یہ ریمارکس خلط مبحث یا اصل بحث سے گریزی کی ایسی صورت ہے، جو فاضل عدالت کے فاضل جج سے متوقع نہیں ہے علاوہ ازیں موصوف نے انٹرسٹ کا مفہوم بھی خود بیان فرما کر سود کے جواز کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ انٹرسٹ کا مطلب موجودہ دور میں سود نہیں بلکہ نقصان کا ازالہ سمجھا جاتا ہے اگر فاضل موصوف کی اس بات کو درست سمجھ لیا جائے تو سود کے جواز اور عدم جواز کی بحث ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اور اگر موصوف اپنے اس موقف پر ہی قائم رہتے ہیں جو یکسر کہ غلط اور بے بنیاد ہے تو پھر اس بینچ کی طرف سے جو فیصلہ آ سکتا ہے، وہ محتاج وضاحت نہیں۔

پس چہ باید کرد؟

اس صورت حال میں اہل دین کی کیا ذمہ داری ہے جو ملک کو سود جیسی لعنت سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے کوشاں بھی ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے قانونی و آئینی ماہرین سے مشاورت کر کے شرعی عدالت کے موجودہ بینچ کے بارے میں غور ہونا چاہئے کہ یہ بینچ آئینی ضابطے کے مطابق ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس بینچ کو اس مقدمے کی سماعت کا حق ہی حاصل نہیں ہے۔ چہ جائیکہ اس کے فیصلے کو قانونی حیثیت حاصل ہو۔

شرعی عدالت کے بارے میں آئین کیا کہتا ہے؟

یہ مسئلہ اس لیے نہایت قابل غور اور بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ شرعی عدالت کے ابتدائی سالوں میں حد رجم کا مسئلہ زیر بحث رہا تھا۔ اور اس وقت آفتاب حسین صاحب شرعی عدالت کے سربراہ تھے، اس وقت عدالت کے سربراہ کو چیف جسٹس نہیں بلکہ چیئرمین کہا جاتا تھا۔ گویا جسٹس آفتاب حسین کی چیئرمینی میں مسئلہ حد رجم بحث ہوئی۔ یہ صاحب بھی منحرف ذہن کے حامل تھے، اس لیے عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ اسلام میں رجم کی کوئی حد نہیں۔

ظاہر بات ہے کہ یہ فیصلہ متواتر احادیث اور اجماع امت کے یکسر خلاف تھا۔ اس لیے اس فیصلے پر شدید احتجاج کیا گیا جس سے مجبور ہو کر صدر ضیاء الحق نے شرعی عدالت کے آئین میں یہ ترمیم کر دی کہ عدالت میں دیگر ججوں کے تین علماء بھی شرعی عدالت میں بطور جج لازمی ہوں گے اور اس کے مطابق تین علماء کو جج نامزد بھی کیا گیا۔ ان میں ایک غالباً شفاعت حسین قادری تھے، دوسرے پیر کرم شاہ ازہری اور تیسرے ڈاکٹر فدا محمد خان۔ بعد میں

مولانا تقی عثمانی صاحب بھی اس کے جج رہے۔اس نئے بینچ کی تشکیل کے بعد مسئلہ حد رجم پر دوبارہ بحث ہوئی جس میں راقم نے بھی بیان دیا تھا،اور پھر فاضل عدالت نے نیا فیصلہ دیا جس میں رجم کو حد شرعی تسلیم کیا گیا۔

اس مختصر تفصیل سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ سب سے پہلے شرعی عدالت کے اس بینچ کی آئینی حیثیت پر غور کیا جائے جو اس مقدمے کی سماعت کے لیے بنا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ دوبارہ حد رجم جیسا غیر شرعی فیصلہ سامنے آجائے۔

اگر بینچ میں تین علماء بطور جج شامل ہوں گے جیسا کہ آئینی تقاضا ہے تو امید ہے کہ بحث کا رخ صحیح ہوگا اور شریعت کے واضح احکام سے انحراف کا امکان بہت کم ہو جائے گا۔

فاضل عدالت سے گزارش

دوسری گزارش ہم فاضل ممبران سے کریں گے کہ اس مقدمے کا دو مرتبہ ایسا فیصلہ ہو چکا ہے جو قرآن وحدیث کے واضح دلائل پر مبنی ہے اور پورے ملک میں اس کو سراہا گیا ہے۔اب اگر شوقِ اجتہاد میں اس سے انحراف کیا گیا تو ایک تو یہ ہے قرآن کی بیان کردہ تمثیل کی روشنی میں اس عورت کے کردار کی طرح ہوگا جو سوت کاتنے کے بعد خود ہی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایسے کردار سے منع فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا﴾ (النحل:92)

ترجمہ:''اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا''۔

اللہ تعالیٰ نے اس موجودہ بینچ کو ایک نہایت اہم موقع عطا فرمایا ہے۔وہ اس سے فائدہ اٹھا کر سابقہ فیصلوں کی توثیق کر کے ایک بہت بڑی سعادت اور عظیم سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں،اور اگر ایسا نہ ہوا اور جسٹس آفتاب حسین جیسا فیصلہ صادر ہوا تو اہل پاکستان کے لیے وہ اسی طرح ناقابل قبول ہوگا جیسے فاضل عدالت کے حد رجم کی بابت غیر اسلامی فیصلے کو رد کر دیا گیا تھا۔

ہماری خواہش اور دعا ہے کہ فاضل عدالت کی طرف سے وہ مذکورہ حد رجم کی طرح کے فیصلے کا اعادہ نہ ہو بلکہ اسلامیان پاکستان کے جذبات کا اسی طرح آئینہ دار ہو جیسے سابقہ دونوں فیصلے تھے۔

وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ۔ آمین

نوٹ:اس مضمون میں بہت سی معلومات حافظ عاطف وحید صاحب (تنظیم اسلامی) کے پمفلٹ انسداد سود کا مقدمہ سے بھی لی گئی ہیں۔

سپریم کورٹ شریعت اپیلیٹ بینچ کے سوالات کے جوابات[1]

حافظ صلاح الدین یوسف[2]

سوال نمبر 1: ربا کی حقیقت، تعریف اور معنویت کیا ہے؟

جواب: رِبا عربی زبان کا لفظ ہے اور قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کے لغوی معنی زیادتی، بڑھوتری، اضافے کے ہیں۔ لیکن شرعی اصطلاح میں اس سے مراد مطلق اضافہ اور زیادتی نہیں ہے، بلکہ ایک مخصوص قسم کی زیادتی ہے اور وہ ہے کہ "کسی کو اس شرط کے ساتھ رقم ادھار دینا کہ واپسی کے وقت وہ کچھ رقم زیادہ لے گا۔" مثلاً کسی کو سال ۴ یا چھ مہینے کے لیے 100 روپے قرض دیئے، تو اس سے یہ شرط کرلی کہ وہ 100 کے 120 روپے لے گا۔ مہلت کے عوض یہ 20 روپے جو زیادہ لیے گئے ہیں، یہ سود ہے۔ ورنہ انسان کاروبار کرتا ہے تو وہ سو روپے کے عموماً 20، 25 روپے نفع کمالیتا ہے، یا کسی کو سو روپے قرضِ حسن کے طور پر دیتا ہے، دیتے وقت سوائے ہمدردی اور ثواب کے کوئی اور نیت نہیں تھی۔ لیکن قرض لینے والا اپنے طور پر ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ (الرحمٰن: 60) کے تحت 10، 20 روپے زائد دے دیتا ہے تو یہ دونوں اضافے سود کی ذیل میں نہیں آئیں گے، کیونکہ کاروبار اور تجارت ایک جائز فعل ہے، اللہ نے اسے حلال اور مشروع کیا ہے، اور اس کا مقصد ہی نفع کمانا ہے۔ اس لیے تجارت کے ذریعے سے جتنا اضافہ حاصل ہوگا بشرطیکہ اس میں کسی امر حرام کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو، وہ حلال اور جائز ہوگا۔ اسی طرح قرض دیتے وقت، قرض دینے والے نے زیادتی کی شرکوئی ط عائد نہیں کی تھی، صرف اللہ کی رضا کے پیش نظر مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے قرض دیا تھا، اب قرض لینے والا اگر اپنی مرضی سے

---

[1] یہ مضمون آج سے تقریباً 18، 19 سال قبل کا تحریر کردہ ہے

[2] مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان، نگران شعبہ تحقیق وتصنیف المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

کچھ رقم زائد دے دے،تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔[1] یہ اضافہ بھی سود نہیں ہے۔

بہرحال سود کی تعریف میں وہ اضافہ آئے گا جو شرط کر کے لیا جائے۔اور وہ اضافہ بھی صرف مہلت کا عوض ہو۔یہ ربالنسیئة یاربا الجاهلية کہلاتا ہے۔اسے ربالنسیئةاس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ادھار پرسود لیا جاتا ہے کہ اس کے معنی ہی ،ادھار کا سود ہیں۔اور اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کا چلن تھا،اس لیے اسے ربا الجاهلية بھی کہا جاتا ہے۔۔۔اس کے علاوہ شریعت نے ربا کی بعض مزید صورتوں کو بھی حرام کیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

''الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبروالشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل يدً بيد،فمن زاد أواستزاد فقد أربى،الآخذ والمعطى فيه سواء''۔[2]

''سونا سونے کے بدلے،چاندی چاندی کے بدلے،گندم گندم کے بدلے،جو جو کے بدلے،کھجور کھجور کے بدلے،نمک نمک کے بدلے،یہ برابر برابر ہوں اور ہاتھوں ہاتھ(نقد)ہوں۔(تب ان کا باہمی تبادلہ جائز ہے)جس نے زیادہ دیا یا زیادہ طلب کیا،تو اس نے سودی معاملہ کیا، لینے اور دینے والا دونوں اس میں برابر ہیں''۔[3]

اس حدیث کی رو سے(مثلاً)گندم کا تبادلہ گندم سے کرنا ہے،تو ایک تو وہ برابر برابر ہو دوسرے ہاتھوں ہاتھ(نقد)ہونا بھی ضروری ہے۔اس میں کمی بیشی ہوگی تب بھی اور ہاتھوں ہاتھ(نقد)ہونے کی بجائے ایک نقد اور دوسری ادھار یا دونوں ہی ادھار ہوں،تب بھی یہ سود شمار ہوگا۔تاہم ایک جنس کا دوسری جنس سے کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز ہے،بشرطیکہ دست در دست(ہاتھوں ہاتھ)ہو۔

غرض شریعت میں ربا کا اطلاق''بیع میں ایک جیسی دو چیزوں کے تبادلے میں کسی ایک چیز میں ہو یا قرض کی واپسی کے وقت اصل چیز یا رقم میں ہو''۔پر ہوتا ہے۔۔۔اس کی دو صورتیں ہیں:

---

[1] صحيح البخاری:باب حسن القضاء

[2] صحيح المسلم،كتاب المساقاة،باب الصرف بيع والذهب بالورق نقداً

[3] صحيح المسلم:حدیث نمبر:1584

(1) ربا الفضل: ایک جیسی دو چیزوں کے تبادلے کے وقت ایک چیز کے عوض میں زیادہ لینا۔ [1]

(2) ربا النسیئۃ: ایک جیسی دو متبادل چیزوں میں سے کسی ایک کا زیادہ معاوضہ لینا، مگر ایک مقررہ مدت کے بعد۔

یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ سودی معاملے میں کسی قسم کا تعاون بھی لعنت اور غضبِ الٰہی کا باعث ہے۔ اس شدت کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایسا معاشرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جس کی بنیاد اُخوت، ہمدردی، ایثار و قربانی پر ہو۔ کسی کو مال کی ضرورت ہو، تو اصحابِ اموال ضرورت مندوں کی ضرورت فی سبیل اللہ، اللہ کی رضا کے لیے پوری کردیں یا پھر قرضِ حسن کے طور پر۔ جب کہ سود کی بنیاد اس کے برعکس خود غرضی، دوسرے کے استحصال اور ظلم پر ہے۔ اس میں اصحابِ ثروت کسی ضرورت مند سے اللہ کی رضا کے لیے تعاون پر آمادہ نہیں ہوتے۔ انہیں صرف اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے، غریب کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے باوجود ان کی حرص میں کمی نہیں ہوتی۔ اس لیے شریعت نے ہر قسم کے سود کو ممنوع اور حرام قرار دیا ہے۔ چاہے وہ ذاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے دیئے گئے قرض پر وصول کیا جائے یا تجارتی مقاصد کے لیے حاصل کردہ رقم پر۔

---

[1] **ربا الفضل کی مختلف صورتیں:** ہر مال کا ایک وصف عام ہوتا ہے، اس اعتبار سے اسے جنس کہا جاتا ہے اور ایک وصف خاص ہوتا ہے جسے صنف (قسم) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے غلہ جات ہیں، یہ اپنے وصف عام (کہ ان کو کھایا جاتا ہے) کے اعتبار سے ایک جنس ہیں۔ یعنی کھانے والی جنس۔ لیکن وصف خاص کے اعتبار سے غلہ جات کی کئی صنفیں (قسمیں) ہیں۔ جیسے چاول، جو، گندم، مکئی جوار وغیرہ۔ یہ سب وصف عام کے اعتبار سے ایک جنس ہیں۔ جنس مطعومات، لیکن اپنے اپنے خاص اوصاف کے اعتبار سے یہ الگ الگ قسمیں ہیں۔ چاول ایک قسم ہے، گندم ایک قسم، جوار ایک، مکئی ایک، منقیٰ ایک اور نمک ایک وغیرہ۔ ہر کھانے والے چیز کو اس پر قیاس کر کے اس میں شامل کیا جاسکتا ہے چاہے وہ ماپ کر فروخت ہوتی ہو یا تول کر۔۔۔ ایک مال کی قسم وہ ہے جسے ثمن کہا جاتا ہے جیسے سونا، چاندی ہے اور اسی پر آج کل قیاس کیا جاسکتا ہے: سکے، کرنسی نوٹ، چیک اور کمپنیوں کے شیئرز (حصے) وغیرہ کو۔

شریعت میں ان دونوں قسموں کی بابت اَحکام وارد ہیں۔ حدیث میں جن چھ چیزوں کا ذکر ہے وہ ان دونوں قسموں کو حاوی ہیں: سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور اور نمک۔ بعض ائمہ نے سودی معاملات کو صرف ان چھ چیزوں تک محدود رکھا ہے۔ باقی دیگر چیزوں میں وہ کمی بیشی کو سود قرار نہیں دیتے۔ جب کہ دیگر ائمہ و فقہاء نے قیاس کر کے دوسری چیزوں کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً جو کھانے والی چیزیں ہیں چاہے کیلی (ماپی جانے والی) ہوں یا وزنی (تولی جانے والے) یا جن میں (سونے چاندی کی طرح) ثمنیت پائی جاتی ہے، یا بعض (بقیہ حصہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

سوال نمبر2: کیا ''ربا'' کی اصطلاح کا بینکوں اور مالیاتی اداروں کے دیئے گئے قرضوں اور ان پر عائد کردہ سود پر بھی اطلاق ہوتا ہے؟

جواب: یہ سوال اس لیے پیدا ہوا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''قرآن نے جس سود سے روکا ہے، وہ صرف وہ سود ہے جو ذاتی ضروریات کے لیے لیے گئے قرض پر لیا جائے۔ لیکن جو قرض تجارت اور کاروبار کے لیے لیا جائے۔ اس پر لیا جانے والا سود اس کی ذیل میں نہیں آتا اور نہ وہ ممنوع ہی ہے، کیونکہ نزول قرآن کے وقت تجارتی قرض کا رواج ہی نہ تھا۔۔۔ لیکن یہ دعویٰ بالکل بے دلیل ہے۔ علماء نے بڑی وضاحت اور تفصیل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی دونوں قسم کے قرضے لیے جاتے تھے، ذاتی ضروریات کے لیے بھی اور کاروبار اور تجارت کے لیے بھی اور دونوں پر سود لیا اور دیا جاتا تھا اور قرآن کریم میں بغیر کسی قسم کی تفریق کے سود کو حرام قرار دیا گیا ہے، جس کا مطلب ہر قسم کے سود کی ممانعت اور حرمت ہے، چاہے قرض ذاتی ضرورت کے لیے لیا گیا ہو یا تجارت کے لیے۔

اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں ظلم اور خودغرضی کا پہلو پایا جاتا ہے۔ ذاتی ضرورت پر لیے گئے قرض پر سود کا ظلم تو مسلّم ہے، لیکن تجارتی قرض پر سود میں بھی ظلم صریح اور بدترین خودغرضی کا پہلو پایا

(بقیہ حصہ) نزدیک جن کو ذخیرہ کیا جا سکتا ہو۔ اس حساب سے ایک جنس وزنی چیزوں کی ہے یعنی جنہیں تول کر بیچا اور خریدا جاتا ہے۔ دوسری جنس کیلی چیزوں کی ہے جنہیں پیمانوں سے ماپ کر بیچا جاتا ہے اور ایک جنس ان چیزوں کی ہے جنہیں ذخیرہ کیا جا سکتا ہو اور ایک جنس وہ ہے جو ثمن بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، جیسے سونا، چاندی، سکے، کرنسی نوٹ وغیرہ، ان اَموال میں سودی اور غیر سودی صورتیں حسبِ ذیل ہونگی۔

(1) جب دونوں تبادلوں والی چیزیں جنس اور قسم کے اعتبار سے ایک ہوں گی۔ مثلاً گندم کا گندم سے، چاول کا چاول سے تبادلہ ہو، تو اس میں کمی بیشی بھی حرام ہوگی اور اُدھار بھی۔ ان کا برابر ہونا بھی ضروری ہے اور مجلس عقد میں قبضہ بھی ضروری ہے۔

(2) دونوں تبادلوں والی چیزیں جنس کے اعتبار سے ایک ہوں، البتہ قسم کے اعتبار سے مختلف ہوں تو ان میں کمی بیشی جائز ہوگی تاہم اُدھار ناجائز۔ جیسے ایک کلو چاندی کا تبادلہ ایک یا دو گرام سونے کے ساتھ، ایک کلو جو کا سودا آدھا کلو گندم کے ساتھ۔ ایک دینار کا تبادلہ تین چار ریالوں کے ساتھ۔ اگر یہ سودا نقد ہوگا تو جائز ہے۔ اس میں ادھار کرنا صحیح نہیں ہے۔

(3) جب دونوں تبادلوں والی چیزیں جنس کے اعتبار سے بھی ایک نہ ہوں اور قسم کے اعتبار سے بھی مختلف ہوں تو ان میں کمی بیشی بھی جائز ہے اور ادھار کرنا بھی جائز۔ جیسے (مثلاً) ایک کلو گندم کا ایک گرام سونے سے تبادلہ۔ ایک کلو کھجور کا سودا دس یا بیس تولہ چاندی کے ساتھ، ان میں کمی بیشی بھی جائز ہے اور ادھار کرنا بھی جائز۔

جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے بینک سے یا کسی ساہوکار سے کاروبار کے لیے قرض لیا، لیکن کاروبار نہ چل سکا یا کاروبار میں نقصان ہو گیا۔ لیکن قرض دہندہ تو ہر صورت میں اپنا سود کا مطالبہ جاری رکھے گا، حالانکہ وہاں اصل رقم بھی ڈوب گئی ہے چہ جائیکہ وہ اس کے منافع سے سود ادا کرے۔ لیکن بینک یا سود خور مہاجن کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوگی، وہ اصل رقم کے ساتھ اپنا طے شدہ سود بھی ضرور وصول کرے گا۔ اسلام اس ظلم اور خود غرضی کی اجازت کس طرح دے سکتا ہے؟ اس لیے اسلام میں دونوں قسم کے قرضوں پر سود حرام اور ناجائز ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ عرب میں تجارتی مقاصد کے لیے قرض لینے اور دینے کا رواج ہی نہیں تھا صرف ذاتی ضروریات کے لیے ہی قرض لینے اور دینے کا معمول تھا۔ اس لیے جو سود حرام کیا گیا ہے، وہ صرف ثانی الذکر قسم کا سود ہے نہ کہ اول الذکر سود۔ کیونکہ پہلی قسم کے سود کا تو وہاں رواج ہی نہیں تھا۔ اس بنا پر وہ صنعت اور کاروبار کے لیے لیے ہوئے قرض پر سود کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اس کو وہ تجارتی سود سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی بابت کہتے ہیں کہ یہ حرام نہیں ہے، اس سے تو لوگ کاروبار کر کے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اگر وہ اس فائدے میں سے تھوڑا سا فائدہ صاحبِ مال کو ایک سالانہ شرح کے حساب سے لوٹا دیں، تو یہ کس طرح ناجائز ہوسکتا ہے؟ یہ تو صاحبِ مال کا وہ حق ہے جو اپنے مال کی وجہ سے اسے ملنا چاہئے۔ لیکن اوّل تو یہ دعویٰ ہی صحیح نہیں کہ عرب میں تجارتی قرض کا رواج نہیں تھا، عربوں میں تجارتی مقاصد کے لیے بھی قرض لینے دینے کا رواج تھا۔ علاوہ ازیں صنعت و تجارت میں لگے ہوئے سرمائے کی بابت کوئی شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ بہر صورت نفع دے گا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ لاکھوں کروڑوں کا سرمایہ ڈوب جاتا ہے۔ لیکن بینک یا ساہوکار کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ ہر صورت میں اپنے دیئے ہوئے قرض پر سالانہ شرح سے سود وصول کرنا ضروری سمجھتا اور وصول کرتا ہے۔ کیا یہ ظلم نہیں، خود غرضی نہیں، استحصال نہیں؟ اگر نقصان نہ ہو تو یہ سودی قرض گرانی کا باعث بنتا ہے۔ ایک صنعت کار جتنا سود ادا کرتا ہے اسے وہ پیداواری لاگت میں شامل کر کے اپنی تیار کردہ اشیاء کی قیمت مقرر کرتا ہے، جس سے عوام کو وہ چیز نسبتاً مہنگے داموں خریدنی پڑتی ہے۔ اس لیے اسلام نے ہر قسم کے سود کو حرام کر کے ظلم و استحصال اور گرانی کے ایک بہت بڑے ذریعے اور سرچشمے کو بند کر دیا ہے۔

تجارت اور سود میں فرق

بعض لوگ کہتے ہیں کہ سودی قرض بھی تو ایک تجارت ہے، قرآن نے ان کا یہ قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ﴿قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرہ:275) ترجمہ: ''بیع بھی تو مثل سود ہی کے ہے''۔ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا: یہ دونوں چیزیں کس طرح ایک ہوسکتی ہیں۔ بیع کو تو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام؟ جس سے واضح ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں تجارت میں تو نقد رقم اور کسی چیز کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے۔ دوسرے اس میں نفع کا اِمکان رہتا ہے۔ جبکہ سود میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں، تیسرے، تجارت باہم تعاون وتناصر کا نام ہے جبکہ سود خود غرضی، بے رحمی اور سنگ دلی کا۔ چوتھے تجارت میں رقم اور چیز کے تبادلے کے بعد دونوں ایک دوسرے کے تبادلے کے مالک بن جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کا آپس میں کوئی مطالبہ نہیں رہتا۔ جبکہ سود میں ایسا نہیں ہوتا، بلکہ صاحب المال کی طرف سے ہر سال زیادتی کا مطالبہ رہتا ہے جو سالہا سال تک بلکہ بعض دفعہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ ان وجوہ سے سود اور تجارت ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ ایک حلال ہے اور دوسرا حرام۔

لیکن افسوس کی مسلمانوں میں مغرب کی نقالی میں معیشت کی ساری بنیاد سودی نظام پر قائم ہے اور اس سے بچنے کی کوئی سعی و کاوش اسلامی ملکوں کے مغرب زدہ حکمرانوں کی طرف سے نہیں ہو رہی۔ اس طرح مسلمان عوام میں بھی اب سود سے بچنے کا کوئی جذبہ نہیں رہا اور ان کی اکثریت بینک کے سود کو وصول کرتی اور کھاتی ہے اور سودی کھاتوں میں شریک ہوتی ہے۔

بنابریں بینکوں اور مالیاتی اداروں کے دیئے ہوئے قرضوں اور ان پر عائد کردہ سود پر بھی ربا کا اطلاق ہوگا، کوئی بھی سودی قرضہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔

سوال نمبر3: پاکستانی بینک اور بعض مالیاتی ادارے اپنے گاہکوں، مارک اپ پر دوبارہ خریداری کے معاہدوں کی بنیاد پر رقم دیتے ہیں۔ اس طریق کار کے تحت بینک کا گاہک یہ مراد لیتا ہے کہ وہ ایک مخصوص جنس بینک کو فروخت کرتا اور عین اسی وقت اس جنس کو موثر ادائیگی کی بنیاد پر زیادہ مدت کے عوض دوبارہ خرید

لیتا ہے۔ مارک اَپ کی کوئی شرح (فی صد سالانہ) کا اطلاق دوسری فروخت پر ہوتا ہے۔ کیا یہ معاہدہ ''ربا'' کے زمرے میں آتا ہے؟

جواب: یہ بھی ایک حیلہ ہے جس کا مقصد سودی نظام کا نام بدل کر اسے جائز قرار دینا ہے، اس میں بینک کا گاہک قطعاً کوئی چیز بینک کو فروخت نہیں کرتا، صرف فرض کرلیا جاتا ہے جب کہ ایسا کرنا ممنوع ہے، کیونکہ جس چیز کا عملاً وجود ہی نہیں ہے، اُسے فروخت کرنے کے کیا معنیٰ؟ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قبل القبض (اپنے قبضے میں لینے سے پہلے) کسی چیز کو فروخت کرنے سے منع کیا فرمایا ہے۔ جب قبل القبض ہی فروخت کرنا جائز نہیں ہے، تو ایک معاملے کو فرض کر کے اس پر بیع وشراء کے احکام کس طرح لاگو ہو سکتے ہیں؟

پھر وہ گاہک (جو اصل میں بینک سے قرض لینے کا خواہش مند ہوتا ہے) بینک سے اپنی (فرضی) فروخت شدہ چیز بینک سے زیادہ مدت کے عوض دوبارہ خرید لیتا ہے (جس کا مطلب دراصل زیادہ رقم کا حصول ہے) اور پھر وہ گاہک بینک کا سودا ادا کرتا رہتا ہے جس کا نام مارک اپ رکھا لیا گیا ہے۔ اصل مقصد بینک سے تجارت کے لیے قرض لینا ہی ہے، لیکن سیدھے طریقے سے ناک پکڑنے کی بجائے ہاتھ کو پیچھے سے گھما کر ناک پکڑنے کا کام کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ بھی ایک سودی حیلہ ہی ہے جس کا جواز تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

سوال نمبر 4: کیا ''ربا'' کی حرمت کے معاملے میں ایک مسلمان اور غیر مسلم کے مابین کوئی فرق ہے؟ کیا ''ربا'' کی حرمت کا دائرہ غیر مسلموں سے لیے گئے قرضوں یا ایسے مسلم ممالک جن کے قوانین اور قومی پالیسیاں بین الاقوامی مالیاتی قوانین اور پالیسیوں سے منسلک نہیں اور صدر مملکت پاکستان کے کنٹرول میں نہیں ہیں، تک بڑھایا جاسکتا ہے؟

جواب: ''ربا'' کی حرمت میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ جس طرح ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ کوئی سودی معاملہ نہیں کرسکتا، اسی طرح ایک مسلمان کسی غیر مسلم کے ساتھ سودی لین دین نہیں کرسکتا۔ جن لوگوں نے اس میں فرق کیا ہے ان کے پاس اس کی کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس قول کو ان کے اپنوں نے بھی تسلیم نہیں کیا ہے۔

علاوہ ازیں اس کی حرمت کا دائرہ ان تمام مالیاتی قوانین اور پالیسیوں تک وسیع ہے جن پر سودی معاملات کا اطلاق ہوتا ہے، چاہے وہ قرضے غیر مسلموں سے حاصل کیے گئے ہوں یا مسلم ممالک سے، چاہے وہ پاکستان کے کنٹرول میں ہوں یا نہ ہوں۔ان چیزوں سے سود کی حرمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔اصل چیز سود کی وہ تعریف ہے جو پہلے گزری، جو بھی معاملہ اس کی زد میں آئے گا اور اس تعریف کا مصداق قرار پائے گا، اس پر یقیناً حرمت کا اطلاق ہوگا۔

سوال نمبر5: حکومتِ پاکستان اور اس کے زیر کنٹرول بعض ادارے بانڈز اور سرٹیفکیٹس وغیرہ جاری کر کے قرضے حاصل کرتے ہیں اور ایسے بانڈز کے حامل افراد کو مقررہ ہر مدت کے بعد منافع ادا کرتے ہیں۔کیا یہ منافع ''ربا'' کی تعریف میں آتا ہے؟

جواب: یقیناً ان پر ''ربا'' کی تعریف صادق آتی ہے کیونکہ یہ قرضے ہیں، کوئی کاروباری شراکت نہیں ہے، اور حکومت یا اس کے ادارے ان پر ایک طے شدہ رقم منافع کے نام سے (فی صد سالانہ کے حساب) ادا کرنے کے پابند ہوتے ہیں، جب کہ ان کی اصل رقم محفوظ ہوتی ہے، وہ جب چاہیں اپنی رقم لے سکتے ہیں، لیکن جب تک یہ رقم حکومت یا اداروں کے پاس رہے گی، وہ اس پر متعین منافع دیتے رہیں گے۔یہ وہی قرض کے بدلے میں مہلت کا معاوضہ وصول کرنا ہے، جو خالص سود ہے، اس کا نام منافع رکھ لیا گیا ہے، گویا شراب کی بوتل پر ''روح افزاح'' کا لیبل چسپاں کیا گیا ہے۔

سوال نمبر6: یہ امر واضح ہے کہ کاغذ کی کرنسی افراطِ زر کی صورتِ حال میں اپنی قیمت کم کرنے کے رجحان کی حامل ہے۔ایک قرض دار جو پیپر کرنسی کی اپنی مخصوص رقم اگر بطور قرض حاصل کرتا ہے، تو جب وہ یہ رقم ایک طے شدہ مدت کے بعد اپنے قرض خواہ کو لوٹاتا ہے، تو قرض خواہ افراطِ زَر کی وجہ سے نقصان اٹھا سکتا ہے۔اگر قرض خواہ اپنے قرض دار سے اپنے نقصان کی تلافی کے لیے مزید رقم ادا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا یہ مطالبہ سود طلب کرنے کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب: یہ مسئلہ نہایت اہم ہے، کیونکہ جو ملک اقتصادی اور سیاسی استحکام سے محروم ہیں، جن میں بدقسمتی

سے پاکستان بھی شامل ہے، وہاں آئے روز افراطِ زَر کی صورت حال نمودار ہوتی رہتی ہے، جس سے کرنسی کی قدر و قیمت مسلسل گھٹتی ہے۔ اس لیے طویل المیعاد قرضوں پر یقیناً قرض خواہ کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اب اس نقصان کی تلافی کے لیے قرض خواہ اپنے قرض دار سے مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کر سکتا ہے تو یہ سود کی ذیل میں تو نہیں آئے گا؟ ۔۔۔ یقیناً یہ قابل غور اور اجتہادی مسئلہ ہے اور اس قسم کے مسائل کے حل کے لیے اجتماعی اجتہاد ناگریز ہے، یعنی عالم اسلام کے جید علماء اور ماہرین معیشت مل کر اس کے تمام پہلوں پر غور کریں اور اس کے لیے کوئی اصول اور ضابطہ طے کریں تا کہ کسی فریق پر ظلم نہ ہو سکے۔ کیونکہ جس طرح ظلم کرنا صحیح نہیں ہے، اسی طرح کوئی دوسرا شخص یا فریق ظلم کا ہدف بن رہا ہو، تو اس کے ازالے کے لیے بھی سعی کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم کے حکم ﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ (البقرہ:279) ترجمہ: ''خود ظلم نہ کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے''۔ کا مفاد بھی یہی ہے۔

آج سے کئی سال قبل شرعی عدالت میں بھی اس قسم کا ایک کیس آیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ شفعہ کا ایک مقدمہ 20 سال کے بعد انجام کو پہنچا ہے، جبکہ 20 سالوں میں کرنسی کی قدر و قیمت بہت گھٹ چکی ہے۔ اب قیمت کی ادائیگی وہی کی جائے جو 20 سال قبل لی گئی تھی، جو کہ گھٹتے گھٹتے برائے نام رہ گئی ہے، یا اب موجودہ حالات کے مطابق اس میں اضافہ کر کے ادائیگی کی جائے، تا کہ مالک کو بھی نقصان نہ ہو؟ اس وقت جسٹس گل محمد (مرحوم) عدالت کے چیف جسٹس تھے، عدالت نے مختلف علماء سے استفسار کیا، راقم نے اس وقت فاضل عدالت کے سامنے جو رائے پیش کی تھی، مناسب معلوم ہوتا ہے، اسے علماء کی غور و فکر کے لیے یہاں دہرایا جائے۔ یہ تحریر عدالت میں تو شاید محفوظ ہوگی، لیکن کسی اور جگہ ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔۔۔۔ یہ حسبِ ذیل ہے:

کرنسی کی قوت خرید میں کمی کا ادائیگی پر اثر: چند سالوں سے کرنسی نوٹ اپنی مالیتی اعتبار سے جس غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہے، اس کے پیش نظر زیرِ بحث مسئلہ فی الواقع سنجیدہ غور و فکر کا مستحق ہے۔ علماء کو اجتماعی غور و فکر اور بحث و تمحیص کے ذریعے سے اس کا شرعی حل پیش کرنا چاہیے۔۔۔۔ اس سلسلے میں راقم کی رائے حسب ذیل ہے:

کرنسی نوٹ موجودہ دور میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ سونے چاندی کے سکوں کی بجائے اب یہی نوٹ اس کے متبادل بن گئے ہیں۔ لین دین اور مالی معاملات کی اساس بھی یہی نوٹ ہیں۔ اس لیے بعض علماء تو اس کو عرفاً ثمن تک کا درجہ دیتے ہیں، جس طرح کہ سونا چاندی اپنی اصل کے اعتبار سے ہی ثمن ہے۔ لیکن کرنسی کی تمام تر اہمیت کے باوجود اسے بعینہٖ سونا چاندی کی طرح بطورِ ثمن سمجھ کر سونا چاندی والا حکم اس پر لاگو کرنا بعض علماء کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سونا اور چاندی دونوں کا زکوٰۃ کے لیے نصاب متعین ہے جبکہ کرنسی نوٹوں کی زکوٰۃ کرنی ہو تو اس کے لیے کوئی متعین نصاب نہیں ہے، نہ ہی اس کا متعین ممکن ہے۔ کیونکہ کرنسی نوٹوں کی زکوٰۃ کے لیے پہلے سونے یا چاندی (بہ اختلاف علماء) کے متعین نصاب کی کرنسی کے اعتبار سے قیمت متعین کی جائے گی اور پھر اس کے بعد اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی، جس میں ہر سال کمی بیشی کا امکان ہی نہیں، ایک حقیقت اور واقعہ ہے۔

مثلاً اگر کرنسی نوٹوں کے لیے سونے کے نصاب کو بنیاد بنایا جائے (جیسا کہ علامہ یوسف قرضاوی وغیرہ علماء کا خیال ہے) تو ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت کرنسی کے اعتبار سے ہوگی۔ اتنی مالیت کے کرنسی نوٹ اگر کسی کے پاس زائد از ضرورت ایک سال تک موجود رہیں تو پھر ڈھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی، مثال کے طور پر اس وقت سونا 6000 روپے فی تولہ ہے تو 45 ہزار کے کرنسی نوٹوں پر زکوٰۃ (شروطِ مقررہ کے مطابق) اس کے مالک پر عائد ہوگی، اس سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہوگی، لیکن سال دو سال بعد سونا 6 کی بجائے 7 ہزار فی تولہ ہو جائے تو پھر 45 ہزار روپے پر بھی زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ پھر یہ رقم اس سے بھی زیادہ ہوگی تب قابل زکوٰۃ ہوگی۔ یوں سونے کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ کرنسی نوٹوں کی شرح نصاب میں بھی ردوبدل ہوگا۔ (خیال رہے کہ اب 2017 میں سونا فی تولہ پچاس ہزار روپے ہے)

یہی صورت حال کرنسی نوٹوں کی زکوٰۃ چاندی کے نصاب سے وابستہ کرنے کی صورت میں پیش آئے گی۔ جیسا کہ پاک و ہند کے علماء نے چاندی کے نصاب کو ہی کرنسی نوٹوں کی زکوٰۃ کے لیے بنیاد بنایا ہوا ہے اور اس اعتبار سے ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت اس کا نصاب ہے۔ اگر اتنی چاندی 6 ہزار کرنسی نوٹوں

میں آتی ہے تو 6 ہزار کی رقم کرنسی نوٹوں کے لیے زکوٰۃ کا نصاب ہوگی۔ اگر 7 ہزار میں ساڑھے باون تولہ چاندی آئے گی تو 7 ہزار روپے ہوگا، 8 ہزار میں آئے گی تو 8 ہزار نصاب ہوگا۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سونے چاندی کی طرح کرنسی نوٹوں کا کوئی متعین نصاب نہیں ہے، اس لیے شرعی طور پر یہ سونا چاندی کی طرح ثمنیت کے حامل نہیں سمجھے جاسکتے اور جب ان کی حیثیت بالکل سونے چاندی کی طرح نہ ہوئی تو اُصولی طور پر لمبے مالی معاہدات میں کمی بیشی کا جواز تسلیم کیا جانا چاہئے تا کہ کسی ایک فریق کو نقصان نہ اٹھانا پڑے۔

بنابریں حکومت اگر کوئی ایسا قانون یا اُصول وضع اور متعین کرتی ہے کہ جس کی رو سے مالی معاہدات میں کرنسی کی قیمت کے اُتار چڑھاؤ کا اعتبار کیا جاسکے تو شرعاً اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد کرنسی کی قیمت میں خاطر خواہ کمی آجاتی ہے جس سے بعض دفعہ بہت سے لوگوں کو خاصا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اندرون ملک عام لوگوں کو بھی خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے جب کہ کچھ دوسرے لوگوں کو خاص منفعت حاصل ہوجاتی ہے ظاہر بات ہے کہ یہ صورتحال ''لاضرر ولاضِرار'' (مؤطا امام مالک، کتاب البیوع) کے خلاف ہے۔

اسلام کے اس اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ جب کہ کرنسی کی قیمت مسلسل گر رہی ہے تو اس کے لیے حکومت کوئی ایسا اصول اور ضابطہ بھی تجویز کرے جس سے اس سے پیدا ہونے والے نقصان کی تلافی بھی باآسانی ہوسکے۔

مذکورہ بالا وضاحت سے رٹ گزار کے موقف کی اصولی تائید ہوتی ہے کہ 20 سال میں زمین کی قیمت میں سو فیصد ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے قانونِ حق شفعہ کی زیر بحث شق کو اس طرح تبدیل کرنے کی ضرورت ہے جس سے خریدار کو نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ اس موقف میں بظاہر شرعاً کوئی قباحت نظر نہیں آتی کیونکہ اس طرح ایک فریق کے نقصان کا ازالہ مقصود ہے جو مستحسن امر ہے۔ تاہم یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ حکومت کی طرف سے جب تک اس کے لیے کوئی اصول اور ضابطہ تجویز نہیں کر دیا جاتا، اس وقت تک عام لین دین معمول اور عرف کے مطابق کرنا ضروری ہے اور وہ عرف فی الحال یہی ہے کہ جتنی تعداد کے کرنسی نوٹوں میں سودا طے ہوا تھا یا معاہدہ ہوا تھا، اتنی ہی تعداد کے وصول کرنے کا فریق ثانی حقدار ہوگا۔ کرنسی کی قیمت کی کمی

کا اعتبار نہیں ہوگا، کیونکہ کسی اصول اور ضابطے کے بغیر مذکورہ اجازت مفاسد کثیرہ اور نزاعات کا باعث ہوگی۔ تاہم عدالتیں خصوصی کیسوں میں مذکورہ شرعی گنجائش کی روشنی میں کرنسی کی قیمت میں کمی سے پیدا ہونے والے نقصان کے ازالے کا فیصلہ کرسکتی ہیں جیسا کہ زیر بحث مقدمہ میں بھی اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

سوال نمبر 7: اگر سود یا مارک اَپ کی تمام اقسام اسلامی احکامات کے خلاف قرار دی جائیں تو آپ فنانسنگ کے کیا طریقہ ہائے کار تجویز کرتے ہیں:

(الف) تجارت اور صنعت کی فنانسنگ (ب) بجٹ کے خسارے کی فنانسنگ

(ج) بیرونی قرضوں کا حصول (د) اسی نوعیت کی دیگر ضروریات اور مقاصد

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ سود یا مارک اپ کی تمام قسمیں حرام ہیں۔ لیکن اس کے لیے متبادل صورتیں کیا یا کیا اختیار کی جاسکتی ہیں؟ یہ بہت تفصیل طلب مسئلہ ہے۔ اسے یہاں بیان نہیں کیا جاسکتا، علاوہ ازیں علماء اس کی تفصیلات بھی کما حقہ بیان نہیں کرسکتے، کیونکہ یہ ان کا میدان نہیں ہے، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ علماء اور ماہرین معیشت باہم مل کر اس کا حل تلاش اور متبادل تجویز کرسکتے ہیں۔ بلکہ بہت سے حل اور تجاویز پہلے بھی مرتب ہوچکی ہیں جو کتابوں اور رپورٹوں کی شکل میں موجود ہیں۔ خود اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اس مسئلے کے حل کے لیے ماہرین معیشت کے مشوروں سے ایک رپورٹ تیار کی تھی جو موجود ہے، اس کے علاوہ بھی اسلامی بینکاری یا اسلامی معیشت کے نام سے بہت سی کتابیں تحریر شدہ موجود ہیں، جن میں اسی مسئلے پر بحث کی گئی ہے کہ سود سے بچ کر کس طرح ہم اپنے اقتصادی ڈھانچے کو استوار کرسکتے ہیں؟

نیت اگر صاف ہو اور سود سے بچنے کا جذبہ اور داعیہ قوی ہو، تو ابتدائی طور پر ان خاکوں اور تجاویز کو سامنے رکھ کر غیر سودی نظام کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ ابتدا میں یقیناً مشکلات آئیں گی، صدیوں سے بنے بنائے نظام کی جگہ ایک نیا نظام قائم کرنا بلاشبہ جان جوکھوں کا کام ہے، لیکن جو قومیں عزم اور جذبے سے سرشار ہوتی ہیں، وہ مشکلات کو خاطر میں نہیں لاتیں، بلکہ تیشہ فرہاد سے جوئے شیر نکال کر دکھا دیتی ہیں۔ ہم بھی اگر ابتدائی مشکلات سے گھبراتے اور ڈرتے رہے، جو یقیناً پیش آئیں گی، تو کبھی بھی یہ معرکہ سر نہیں کرسکیں گے۔ اس کے لیے پھر

صدیاں بھی ناکافی ہوں گی۔لیکن ہم اللہ پر بھروسہ کرکے اور ایمانی عزم وجذبہ سے سرشار ہوکر یہ تہیہ کرلیں کہ ہم نے اس سودی نظام سے نجات حاصل کرنی ہے۔تو یقیناً چند سالوں میں بھی ہم اس میں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا بھی وعدہ ہے کہ ’’جو ہماری راہ میں کوشش کرتا ہے ہم اس کے لیے راہیں کھول دیتے ہیں‘‘۔

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت:69)

تاہم اس میں کامیابی کے لیے دو محاذوں پر ہمیں سخت محنت اور جدوجہد کرنی پڑے گی۔ایک محاذ قوم کی اصلاح وتربیت اور کردار سازی کا ہے،جس سے ہمارے حکمران بالکل غافل ہیں۔حالانکہ اسلام کا پودا اسلام کی سرزمین پر ہی نشوونما پاسکتا ہے،غیر اسلامی آب وہوا میں ہرگز نہیں پنپ سکتا۔اس وقت ہماری قوم سچائی،امانت ودیانت اور دیگر اخلاقی خوبیوں سے یکسر محروم ہے،الا ماشاء اللہ۔اور اسلامی نظامِ معیشت کا پودا سچائی امانت اور دیانت کی سرزمین پر ہی لگ سکتا ہے،جب تک قوم کے اندر یہ وصف اور خوبی پیدا نہیں ہوگی،اس وقت تک غیر سودی نظام کا پودا یہاں لگ سکتا ہے نہ نشوونما ہی پاسکتا ہے۔اس کے لیے تعلیمی نصاب بدلنا ہوگا،تعلیمی اداروں میں اسلامی روح پھونکنی ہوگی،اخبارات،ریڈیو اور ٹیلی ویژن ان سب کا قبلہ درست کرنا ہوگا ان سب کا قبلہ اس وقت بالکل مخالف سمت میں ہے۔

دوسرے نمبر پر اسلامی معیشت کے اُصولوں پر اپنے بینکاری نظام کو استوار کرنا ہے،اس سلسلے میں اب تک فکرونظر کے دائرے میں جو کام ہوا ہے،اس سے استفادہ کیا اور اسے بنیاد بنایا جائے۔لیکن چونکہ عمل کا میدان،فکرونظر سے مختلف ہے۔ممکن ہے عمل کے میدان میں نئی صورتیں پیش آئیں،جن کا حل پہلی رپورٹوں اور خاکوں میں نہ ہو۔تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔دل میں اخلاص ہو اور جذبہ صادق ہو،تو قدم قدم پر رہنمائی ملتی رہے گی،راستے میں پہاڑ آئیں گے تو وہ بھی راستہ دینے پر مجبور ہوں گے،سمندر آئیں گے تو انہیں بھی عبور کرنا مشکل نہیں ہوگا۔مخالفتوں کی بادِتند بھی اپنا رخ بدل لے گی اور اغیار کی سازشوں کے طوفان بھی آہنی عزم کی چٹان سے ٹکرا کر ختم ہوجائیں گے۔شرط صرف ایک ہی ہے،ایمان،عزم اور قوتِ عمل سے سرشاری۔

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران:139)

سرمایہ کاری کی چند متبادل صورتیں

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ بینک موجودہ سودی طریقہ کر اگر نفع ونقصان کی بنیاد پر مضاربت کا طریقہ چھوڑ کر اختیار کرتا ہے تو اس میں کامیابی کی کوئی اُمید نہیں۔ کیونکہ اس طرح اکثر لوگ کاروبار میں نقصان ظاہر کر کے بینک کی ساری رقم ہڑپ کر جائیں گے۔

موجودہ حالات میں بینک والوں کی یہ بات ایسی نہیں کہ اسے اہمیت نہ دی جائے اور اسے یوں ہی مذاق میں اُڑا دیا جائے، بلکہ قومی اَخلاق کی پستی اور کردار کی زبوں حالی اس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے کہ بینک والوں کی بات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اس کے باوجود۔۔۔؟ عرض کریں گے کہ قوم کو اس اخلاقی پستی سے نکالنے کی ذمہ داری بھی تو حکومت کی ہے، وہ اس طرف بھی توجہ دے تاکہ اقتصاد ومعیشت کی بنیاد بھی صحیح ہو سکے۔

لیکن تعلیم وتربیت اور اصلاح، یہ وسیع المیعاد پروگرام ہے، اوّل تو اس کی طرف کسی کی توجہ ہے نہ مستقبل قریب میں بظاہر کسی حکومت سے اس بارے میں اچھی اُمید ہی وابستہ کی جاسکتی ہے۔ اس لیے بینک کے لیے فی الحال کچھ متبادلات ہیں جن پر بینک سرمایہ کاری کر کے لاکھوں، کروڑوں کا نفع حاصل کرسکتا ہے۔

مثلاً جس صنعت وکارخانے وغیرہ کے لیے بینک رقم مہیا کرے، تو بینک اس کی مؤثر نگرانی کے لیے اپنے چند آدمی بھی اس میں رکھوا سکتا ہے، یہ نگرانی اور بندوں کی تقرری معاہدے کا باقاعدہ حصہ ہو، تو بینک کے ساتھ فراڈ کرنا ممکن نہیں رہے گا۔

(2) بینک قابل کاشت زمینیں خرید کر اس پر سرمایہ کاری کریں اور مزارعت یا نقد ٹھیکے پر وہ زمینیں کاشت کرنے والوں کو دیں۔ یہ مزارعت اور نقد ٹھیکہ جائز ہے، بینک اس کاروبار کے ذریعے سے معقول آمدنی حاصل کرسکتے ہیں۔

(3) اسی طرح ملک میں زمینوں کا ایک بہت بڑا حصہ بیکار پڑا ہوا ہے، وہ زمینیں بنجر یا ریگستانی ہیں۔ لیکن اگر ان پر سرمایہ کاری کی جائے، تو وہ قابل کاشت ہوسکتی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے ذاتی طور پر ایسا کیا ہے تو واقعی اس کے بہت مفید دنتائج سامنے آئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ''جنگ'' کے ایک کالم نگار جاوید چوہدری کا

کالم بعنوان ''چولستان کے دکھ کون سنے گا'' شائع ہوا ہے، چولستان بہاولپور کا ایک صحرائی اور ریگستانی علاقہ ہے۔ اس علاقے میں ایک صاحب نے چند مربع زمین لے کر اس میں جو جنتِ ارضی بسائی ہے، وہ حکومت اور بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کرنے والوں، دونوں کے لیے لمحہ فکریہ اور دعوتِ غور ہے۔ چونکہ ہم نے یہ تجویز پیش کی ہے اور اس کی عملی مثال ہمارے سامنے آئی ہے، اس لیے اس کالم کا یہ متعلقہ حصہ ملاحظے کے لیے پیش خدمت ہے۔۔۔۔کالم نگار لکھتے ہیں:

''چولستان سے واپسی پر ایک عجیب منظر دیکھا۔ ریت کے ٹیلوں، چھدری جھاڑیوں اور آوارہ بگولوں کے عین درمیان جنت کا ایک ٹکڑا تھا۔ زمین پر سبزہ بچھا تھا، گھنے درخت آسمان کی طرف منہ اُٹھائے کھڑے تھے، کپاس بارتھی اور چھوٹی سی نہر ساتھ ساتھ بہ رہی تھی، ہم لوگ وہاں رُک گئے۔ میں نے جنت کے رکھوالے سے مالک کا نام پوچھا، اس نے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا: ''یہ سیٹھ عقیل الرحمٰن کے مربعے ہیں''۔ یہ نام میرے لیے جانا پہچانا تھا، میں نے اپنے ساتھیوں سے سیٹھ صاحب کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا سیٹھ عقیل الرحمٰن قومی اسمبلی کے رکن ہیں، حکام کی مہربانی سے چولستان سے ساٹھ ستر مربع اراضی حاصل کی۔ اسے ہموار کیا اور میلوں دور بہتی نہر کا پانی کاٹ کر ریت کو سونا بنالیا۔ جب یہ داستان سنائی جارہی تھی تو میں سیٹھ عقیل الرحمٰن کا حوالہ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں ان سے واقف ہوں یا میں نے اُن کے بارے میں سن رکھا ہے۔ ابھی داستان جاری تھی کہ میرے دماغ میں روشنی کا گولہ پھٹا اور میں نے اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا: ''کہیں یہ سیٹھ صاحب وہی تو نہیں ہیں'' ساتھی نے ہاتھ چھڑا کر جواب دیا: ''ہاں وہی سیٹھ عقیل الرحمٰن ہیں جو وزیر اعظم کو ساتھ لے کر پہنچے، محکمہ آبپاشی کے افسر طلب کرائے اور انہیں پانی چوری کرانے کے جرم میں ہتھکڑیاں لگوادیں''، میں نے حیران ہوکر پوچھا: ''کیا ان کی زمینوں کو سیراب کرنے والا یہ پانی جائز ہے؟'' میرے ساتھی نے قہقہہ لگایا اور ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے بولا ''چوہدری صاحب! ناسمجھ بچوں جیسے سوال نہ کیا کریں!!

سیٹھ عقیل الرحمٰن کی تشکیل کردہ جنت سے آگے نکل کر میں نے سوچا، اگر نہر سے پانی کی پتلی سی لکیر نکل کر صحرا کے دوزخ میں فردوس کا یہ ٹکڑا تخلیق کرسکتی ہے تو ایک ذرا سی بڑی آبی لکیر پورے صحرا کو جنت کیوں نہیں بنا

سکتی؟صدیوں سے جگہ بدلتے ٹیلوں اور برسوں سے بوندوں کو ترستے بگولوں نے سرگوشی کی ''بنا سکتی ہے، بنا سکتی ہے''۔۔۔لیکن اس کے لیےایک دور تک سوچنے والا لیڈر چاہئے''۔ میں نے کہا''ہمارے پاس ایسا لیڈر ہے تو سہی'' ٹیلے قہقہہ لگا کر بولے''نہیں نہیں جس لیڈر کے پاس مہر اقبال جیسےلوگوں کے زخموں پر پھائے رکھنے کا وقت نہ ہو،وہ لاکھوں سال کی منتظر زمینوں کا دکھ سننے کے لیےفرصت کہاں سے لائے گا''۔[1]

(4)اسی طرح کمپنیوں کے شیئرز ہیں۔اس میں بھی کاروباری شراکت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔اس میں اصل خرابی سٹے کا جز شامل ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔اگر قانونی طور پر اس خرابی کو شامل ہونے سے روک دیا جائے،تو شیئرز کے کاروبار سے بھی بینک بہت منافع حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ سرمایہ کاری کی چند مثالیں ہم نے اس لیے دی ہیں کہ اگر مضاربت میں کامیابی کا فی الحال امکان نہیں ہے تو سرمایہ کاری کا یہ واحد میدان نہیں ہے، بلکہ سرمایہ کاری کا میدان بہت وسیع ہے اور بہت سی جائز اور متبادل صورتیں سوچی اور اختیار کی جاسکتی ہیں۔اگر سود سے بچنے کا عزم قوی اور داعیہ سچا ہو،تو بہت سی راہیں نکل سکتی ہیں اور اس حرام کاری وحرام خوری سے قوم کو بچایا جاسکتا ہے ورنہ

ع خوئے بدرا حیلۂ بسیار!

اس خوئے بد اور حیلوں بہانوں کا علاج کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔آپ متبادلات کا ڈھیر لگا دیں،خاکوں پر خاکے اور رپورٹوں پر رپورٹیں تیار کر کے دے دیں،ان سے ردّی میں تو اضافہ ہوگا،عمل واقدام کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔گویا ہمارا اصل مسئلہ متبادل اساس کا نہیں ہے،وہ تو موجود ہے اور اسے ہم اپنے عزم اور قوتِ عمل سے مزید بہتر اور سازگار بنا سکتے ہیں۔ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اندر ایمانی عزم کی کمی ہے اور ہم حرام خوری سے بچنے کا کوئی جذبہ اور داعیہ ہی نہیں رکھتے۔

سوال نمبر8:اگر آپ کے خیال میں سود کی تمام اقسام شرعی طور پر حرام ہیں تو شریعت سے اس کے خاتمے کے لیے آپ کیا طریقہ کار تجویز کرتے ہیں،کیا آپ موجودہ اقتصادی نظام کو فوراً ختم کر دیں گے یا

---

[1] روزنامہ جنگ،لاہور،4 ستمبر 1999ء

قومی معاشی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تدریجی عمل تجویز کریں گے؟ اگر آپ تدریجی عمل کو ترجیح دیتے ہیں تو آپ اس مقصد کے لیے کیا حکمت عملی تجویز کرتے ہیں جو قرآن وسنت کے تقاضوں کے مطابق ہو؟

جواب: حکمتِ عملی کے طور پر تدریج کی اہمیت و ناگریریت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔لیکن تدریج کے نام پر عملی اقدامات سے گریز کی تائید بھی نہیں کی جاسکتی۔یہی تدریج مرحوم ضیاء الحق نے بھی اختیار کیے رکھی، جس سے قوم کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔اس لیے تدریج ضروری ہے، تو کوئی نظام بھی راتوں رات نافذ نہیں ہو سکتا۔ایک بنے بنائے نظام کو، جس کی جڑیں بڑی گہری اور وسیع ہوں، اسے اکھیڑ کر ایک نیا نظام استوار کرنا، پھر اس کی نشو ونما اور استحکام کے لیے آب وہوا بھی اس کے موافق بنانا (جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا) ایک مناسب تدریج اور حکمتِ عملی کا تقاضا کرتا ہے۔لیکن اس کے لیے ہمہ جہتی اقدامات، گو تدریج کے ساتھ ہوں، نہایت ضروری ہیں، اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔کسی ایک شعبے میں جزوی یا نیم دلانہ اقدامات سے کچھ نہیں ہوگا، یہاں تو مکمل آپریشن اور سرجری کی ضرورت ہے، جب تک قوم اس عمل جراحی سے نہیں گزرے گی، کسی بھی شعبے میں کامیابی ممکن نہیں۔

سوال نمبر 9: اگر تمام معاملات خلافِ شرع ہیں تو ماضی میں کیے گئے معاملات اور معاہدات کا کیا کیا جائے گا؟ خاص طور پر حکومت پچھلے غیر ملکی قرضوں کے معاملے میں کیا طریق کار اختیار کرے گی؟

جواب: جہاں تک اندرونی معاہدات اور معاملات کا تعلق ہے، ان میں سود کا لینا اور دینا فوراً ممنوع قرار دیا جائے۔تاہم کسی کی اصل رقم پر زَد نہ پڑے، وہ ہر صورت میں واپس کی جائے۔یا پھر یہ رقم مالکوں کی اجازت کے ساتھ غیر سودی معاملات میں شرعی طریقوں کے مطابق استعمال میں لائی جائے اور اس کے نفع نقصان میں ان کو شریک کیا جائے۔اگر حکومت نے غیر سودی نظام قائم کرنے میں اخلاص کا ثبوت دیا، تو قوم بھی اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہوگی، کیونکہ قوم اپنی تمام تر کمزوریوں اور بدعملیوں کے باوجود اسلامی نظام کی خواہشمند اور اس کے لیے جذباتی وابستگی رکھتی ہے۔اس کی اکثریت میں اب بھی اسلام کے لیے قربانی کا جذبہ اور داعیہ موجود ہے، بدقسمتی سے اب تک کوئی حکمران بھی ان کے اس جذبے سے فائدہ

نہیں اٹھاسکا، بلکہ سب نے ان کا استحصال ہی کیا ہے، اس لیےقوم حکمرانوں سے مایوس ضرور ہے، لیکن اللہ سے مایوس نہیں ہے، وہ اب بھی کسی مسلمان مردِغیب کی منتظر ہے۔ جس مقتدر ہستی میں اب بھی ان کو امید کی کوئی کرن نظر آئے گی، وہ اس پر اپنا مال ہی نہیں بلکہ دل و جان بھی فدا کرنے کے لیے تیار ہوگی۔ کاش کوئی مردے ازغیب پیدا ہو اور ''کارے بکند'' کے مصداق کچھ کرکے دکھائے۔

جہاں تک بیرونی قرضوں کا تعلق ہے، یہ ہمارے حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہیں، جن کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ ان قرضوں نے ہم سے ہماری خودی چھین لی ہے، ہماری آزادی کو گروی رکھ دیا ہے، اور ہمیں خوئے غلامی میں پختہ تر کردیا ہے۔ ان کا سلسلہ یکسر اور فوری طور پر ختم کرنا ضروری ہے۔ تاہم ان کی بھی اصل رقم کی ادائیگی ضروری ہے اور سود کی عدم ادائیگی کا فوری اعلان کردینا چاہیئے۔ ہمارے سامنے کئی ملک ہیں جنہوں نے عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے قرضے دینے سے بالکل انکار کردیا ہے، صرف سود ہی نہیں، بلکہ اصل رقم بھی دینے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں۔ جب دوسرے بعض ممالک اتنی جرأت کا مظاہرہ کرسکتے ہیں، تو کیا ہمارے اندر اتنی جرأت بھی نہیں کہ ہم صرف سود ادا کرنے سے انکار کردیں جو سراسر ظلم ہے ہم ظلم کے خلاف بھی لب کشائی نہیں کرسکتے؟ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کرسکتے؟ غیر ملکی قرضوں کی دلدل سے نکلنے کا یہی واحد طریقہ ہے کہ ہم ایک خود انحصاری کی پالیسی اپنائیں اور ایک پیسہ بھی قرض نہ لیں اور دوسرے، اس جرأتِ گفتار اور قوتِ کردار کا مظاہرہ کریں کہ سود دینے سے انکار کردیں۔ اگر ہم نے اپنے اندر یہ جرأت اور قوت پیدا کر لی، تو غیر ملکی طاقتیں ہمارا کچھ نہیں کرسکتیں۔ ہمارا موقف عدل وانصاف کے مطابق ہوگا، اس لیے جیت ہماری ہی ہوگی، نہ کہ قرض دینے والی طاقتوں کی، جو دراصل ظالم اور کمزور قوموں کا خون چوس لینے والی ہیں۔

سوال نمبر10: کیا قرض دینے والا قرض سے متعلق منافع حاصل کرنے کا وقت اور اس کی شرح مقرر کرسکتا ہے جبکہ قرض لینے والا یہ کہہ رہا ہو کہ وہ مطلوبہ روپیہ کمانے اور بروقت رقم لوٹانے کے قابل ان شاء اللہ ہوجائے گا اور اس کے بعد قرض لینے والا رقم کی ادائیگی میں تاخیر کرے تو گارنٹی دینے والا منافع، بونس یا تلافی کے لیے زائد رقم دے سکتا

ہے۔اگراس صورت حال میں انشورنس کا نظام متعارف کرایا جائے تو اس کی کیا صورت ہوگی اوراس کا جواز ہوگا؟

جواب: یہ سوال کئی سوالات کو متضمن ہے۔اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قرض دینے والا قرض پر کوئی متعین منافع لے ہی نہیں سکتا،تو اس کی شرح مقرر کرنے کا کیا سوال؟البتہ قرض کی واپسی کے لیے وقت کا تعین کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ تو قرض دینے والے کا حق ہے کہ وہ اپنی رقم کی واپسی کے لیے وقت کی تعیین اور تاکید کرے۔لیکن اس رقم پر چونکہ متعین منافع سود کی ذیل میں آتا ہے،اس لیےاس کی شرح کا تعین نہیں کیا سکتا،اگر کیا جائے گا تو یہ معاملہ سودی بن جائے گا۔

اسی طرح گارنٹی دینے والا بھی اصل رقم کی واپسی کی گارنٹی دیتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہے۔لیکن منافع کی گارنٹی دیتا ہے،تو یہ سود کی گارنٹی دینا ہے جو نا جائز ہے۔

اس میں تیسرا مسئلہ انشورنس کے نظام کا ہے،انشورنس کی آج کل بے شمار قسمیں ہیں: قرض کے تحفظ کے لیے انشورنس کا کوئی نظام تجویز کیا جاتا ہے،تو ایسا کرنا جائز ہوگا بشرطیکہ اس کا طریق کار شریعت کے خلاف نہ ہو۔لیکن اگر اس کا مقصد سودی قرضوں کا تحفظ ہے تو یہ ناجائز ہوگا۔

نیز اس سوال سے اگر مقصد یہ ہے کہ قرضوں کی بروقت ادائیگی نہ کرنے سے دائن کو افراطِ زَر کی وجہ سے جو نقصان ہوسکتا ہے،اس کے اِزالے کے لیے کوئی ضابطہ بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب اثبات میں ہے۔اس کے لیے یقینا ضابطہ بنایا جاسکتا ہے بلکہ بنایا جانا چاہئے۔ کیونکہ ہمارے ملک میں قرضوں کی وصولی ایک نہایت سنگین مسئلہ ہے۔دائن تو ضرورت پر قرض دے کر ایک احسان کرتا ہے،لیکن ہماری قوم سخت احسان فراموش ہے،وہ حسن قضاء کی بجائے قرضہ ہی ہڑپ کر جانے کی کوشش کرتی ہے،علاوہ ازیں دکانداروں اور سرمایہ داروں میں بھی قرضوں کی عدم ادائیگی کا رجحان عام ہے،اس عادتِ بد کی وجہ سے بہت سے صنعت وحرفت سے وابستہ افراد، جو محدود سرمائے کے حامل ہوتے ہیں، اپنا کاروبار ہی بند کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔اس لیے قرضوں کی بروقت ادائیگی کے لیے اگر کچھ اصول اور ضابطے تجویز کرلیے جائیں تو ان سے یقیناً ان خرابیوں کے ازالے میں مدد مل سکتی ہے۔اس کے لیے ایک تو تحریری معاہدہ

ضروری قرار دیا جائے جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔

دوسرے بروقت ادائیگی نہ کرنے میں جو نقصان ہوسکتا ہے، اس کا ازالہ افراطِ زَر کی روشنی میں کیا جائے یا قرضوں کو کسی مستحکم چیز سے وابستہ کر دیا جائے، مثلاً چاندی یا سونے کی قیمت سے یا کسی مضبوط کرنسی سے۔ مثلاً کسی نے پچاس ہزار روپے چھ مہینے یا سال کے وعدے پر لیے، تو اس کے لیے ضابطہ بنایا جا سکتا ہے کہ جس تاریخ کو قرض دیا گیا، اس روز پچاس ہزار اتنے تولے سونے کی مالیت کے حامل تھے، یا اس کے اتنے ڈالر یا پونڈ آتے تھے، ادائیگی کے وقت اتنے ہی تولے سونے کی رقم یا اتنے ہی ڈالر پونڈ کی شکل میں وصولی کی جائے۔ کاروباری قرضوں پر بالخصوص ان ضابطوں کا اطلاق کیا جائے، تاکہ کاروباری لوگ بلاوجہ محدود سرمایہ رکھنے والے لوگوں کو پریشان کرنا چھوڑ دیں اور بروقت رقم کی ادائیگی کر دیں اور ادھار بھی کرنا ہو تو اسے زیادہ لمبا نہ کریں۔

اس ضابطے سے یقیناً قرضوں کے ڈوب جانے کے امکانات میں بھی کمی آئے گی اور چھوٹے موٹے کاروباریوں کی مشکلات بھی کم ہوں گی۔ اس کے لیے پھر ایک عدالت کا قیام بھی ناگریز ہوگا، جہاں ان معاملات کا فیصلہ ہو سکے۔

هذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

پاکستان اور سعودی عدالتی نظام کی خصوصیات اور تقابلی جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبد الرحمٰن مدنی [1]

مقدمہ

قضا (نظامِ قضا)، عدل اور قانون کا لغوی اور اصطلاحی تعارف

(الف) قضا کی لغوی تعریف

لغوی طور پر قضا کا مادہ (RoSot) 'ق،ض،ی' ہے جس کے درج ذیل معانی آتے ہیں:

1. "إحكام الأمر وإتقانه والفراغ منه"۔

دوسرے الفاظ میں "القاطع للأمور المحكم لها' أي إتمام الشيء قولا وفعلا"۔ [2]

"کسی معاملے کو مضبوط اور پختہ کرنا اور (مکمل کرکے) اس سے فارغ ہوجانا"۔

بالفاظِ دیگر "مکمل کیے گئے اُمور کو حتمی کردینا"

یعنی قولاً وفعلاً اسے مکمل کردینا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے یہ فرامین ہیں:

﴿فَقَضَاهُنَّ سَبۡعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوۡمَيۡنِ﴾ (سورۃ الصّافات:12)

---

[1] صدر جامعہ لاہور الاسلامیہ (D.G International Judicial Institute)

[2] عرنوس، تاریخ القضاء في الاسلام مصر: ص2

’’تب اُس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیے۔‘‘ یعنی ان کی تخلیق کو مکمل کر دیا

﴿فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ﴾ (سورۃ البقرۃ:200)

’’پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو، تو جس طرح اپنے آبا و اجداد کا ذکر کرتے تھے، اس طرح اللہ کا ذکر کرو۔‘‘

﴿فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ﴾ (سورۃ الأحزاب:23)

’’ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔‘‘

2 القضاء کا مطلب ’الحکم‘ یعنی فیصلہ کرنا اور ’الإلزام‘ یعنی دوسرے پر لازم کرنا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ﴾ (سورۃ طٰہٰ:72) یعنی ’’تم فیصلہ کرلو جو بھی کرنا ہے۔‘‘ اسی بنا پر قاضی کو قاضی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ لوگوں کے معاملات میں فیصلے کر کے اُن پر لاگو کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے فرامین ہیں:

﴿وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ﴾ (سورۃ المائدۃ:49)

’’(اے محمد ﷺ!) تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق اِن لوگوں کے مابین فیصلہ کرو۔‘‘

﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (سورۃ المائدۃ:47)

’’اور جو لوگ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہ ظالم ہیں۔‘‘

حاصل کلام یہ ہوا کہ قضا کے اندر فیصلے کی پختگی اور نفاذ کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔

3 قضا کا مطلب الأمر بھی ہے یعنی ’’صرف حکم دینا‘‘ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ (سورۃ الأسرا:23)

’’تیرے ربّ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ اپنے رب کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو۔‘‘

(ب) 'قضا' کا اصطلاحی مفہوم

قضا کے اصطلاحی معنی درج ذیل ہیں:

"فصل الخصومات وقطع المنازعات بحكم شرعي على سبيل الإلزام"۔[1]

"جھگڑوں اور تنازعات کو یوں ختم کر دینا کہ شرعی حکم فریقین پر لازمی قرار پائے۔"

"فصل الخصومات بقول ملزم صادر من ذي ولاية عامة[2] أي فصلها بين الناس بالأحكام الشرعية حسما للتداعي وقطعا للنزاع "

"حاکم کی جانب سے صادر ہونے والے لازمی آرڈر کے ساتھ جھگڑوں کو ختم کرنا۔" یعنی "شرعی احکام کے ذریعے لوگوں کے درمیان دعووں کے خاتمے اور نزاع کو نمٹانے کے لیے فیصلہ کرنا۔"

مسلم فقہانے اس کی متعدد تعریفات کی ہیں جن کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ دو جھگڑا کرنے والوں کو اس فیصلہ کا پابند کیا جائے جو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہو، گویا اس فیصلہ کو ان پر نافذ کیا جائے۔

'نظامِ قضا' کی تعریف

'شرعی نظامِ قضا' کی تعریف یوں ہے:

" نظام القضاء في الشريعة الإسلامية يقوم على جملة أركان ومرتكزات فهو يستلزم وجود من يقوم بحسم الخصومات وفض المنازعات"۔[3]

"شریعتِ اسلامیہ میں نظامِ قضا ان تمام ستونوں اور بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، جو جھگڑوں کے خاتمے اور تنازعات کے حل کے ضروری ہوتے ہیں۔"

جبکہ عام یعنی 'وضعی نظامِ قضا' کی تعریف یوں کی گئی ہے:

---

[1] حاشیہ ابن عابدین:5/352، مواهب الجليل للحطاب 6/86

[2] ابن ابي الدم، أدب القضاء تحقيق محي هلال السرحان ج1/125، 126

[3] مقدمة "نظام القضاء في الشريعة الإسلامية" للدكتور عبد الكريم زيدان، بغداد (العراق)

''مجموعة من القواعد المنظمة لهيئات السلطة القضائية في الدولة ولولايتها''۔[1]

''ایسے ضوابط کا مجموعہ جو ریاست میں عدلیہ اور بااختیار اداروں کی تنظیم کی غرض سے بنائے جاتے ہیں۔''

نوٹ: قواعد وضوابط کی عملداری کے دوران جو رویے تشکیل پاتے ہیں، وہ بھی ایک روایت بن جاتے ہیں ان ضوابط اور روایات کا مجموعہ 'نظام' کہلاتا ہے۔

(ج) قانون، عدل اور شریعت

قانون کے لفظ کا پس منظر اور مفہوم یہ ہے:

''القانون كلمة يونانية الأ صل تلفظ كا هيKanun فانتقلت إلى الفارسية بنفس اللفظ ثم عُربت عن الفارسية بمعنى الأصل ودرج استخدامها بمعنى 'أصل الشيء الذي يسير إليه أو المنهج الذي يسير بحسبه أو النظام الذي على أساسه تنتظم مفردات الشيء''۔

''لفظ 'قانون' یونانی الاصل ہے جو پہلے فارسی میں اسی تلفظKanun کے ساتھ منتقل ہوا پھر فارسی سے اپنے اصلی معنیٰ میں ہی عربی زبان میں استعمال ہونے لگا جس کا مفہوم وہ بنیاد ہے جس کے مطابق عملداری ہوتی ہے یا وہ طریق کار ہے جسے اختیار کیا جاتا ہے یا ایسا نظام ہے جس کے تحت کسی معاملے کے اجزاء ترتیب پاتے ہیں۔''

قانون کی عام اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ

''القانون هو مجموعة القواعد القانونية التي تهدف إلى تنظيم سلوك الأفراد في المجتمع وتكون مسحوبة بجزاء توقِعه السلطة العامة على المخالف عند الاقتضاء''۔[2]

''قانون سے مراد قانونی قواعد کا وہ مجموعہ ہے جن کا مقصد معاشرے میں افراد کے رویوں کو منظم کرنا ہو، جبکہ وہ کسی ایسی سزا کے ساتھ منسلک ہو، جسے بوقتِ ضرورت خلاف ورزی کرنے والے

---

[1] قانون المرافعات المدنية والتجارية:ص31

[2] وكي پیڈیا، بوابة القانون

پر پبلک اتھارٹی (حکومت) جاری کرے گی۔''

قانون کی دوسری تعریف یوں کی گی ہے:

"وهو القواعد التي تنظم سلوك الأفراد في المجتمع تنظيمًا ملزمًا ومن يخالفها يعاقب وذلك كفالة لاحترامها"۔

''قانون سے مراد وہ قواعد ہیں جو معاشرے میں افراد کے رویّوں کو لازمی طور پر منظم کرنے کے لیے ہوتے ہیں، اور جو کوئی ان کی مخالفت کرتا ہے، اسے سزا دی جاتی ہے، اور یہ سزا اس قانون کے احترام کی غرض سے دی جاتی ہے۔''

خصوصی قوانین

(ا) خصوصی معاملات پر بننے والے قانون کی تعریف یہ ہے:

"مجموعة القواعد المنظمة لأمر معيّن وضعت عن طريق السلطة التشريعية"۔ [1]

''کسی بھی خاص موضوع پر قوانین کا ایسا مجموعہ، جو قانون سازی کا اختیار رکھتے ہوئے تشکیل دیا گیا ہو۔''

(ب) کسی خاص علاقے کے لیے بننے والے قانون کی تعریف یہ ہے:

"مجموعة القواعد القانونية النافذة في بلد ما يقال القانون الفرنسي"۔ [2]

''کسی ملک میں نافذ قانونی قواعد کا مجموعہ جیسے کہا جاتا ہے: فرانسیسی قانون''

قانون کی تیسری تعریف یوں کی گئی ہے:

"القانون هو مجموعة من القواعد والأسس التي تعمل على تنظيم المجتمع"۔ [3]

---

[1] دروس في أصول القانون د/ جميل الشرقاوي: 13/1 دار النهضة العربية، القاهرة 1979م

[2] المدخل لدراسة القانون لـ د/ أحمد سلامة 15/1، مكتبة النهضة، مصر. الإسلام والدستور: تأليف توفيق بن عبد العزيز السديري: 15/1، وزارة الشؤن الإسلامية والأوقاف

[3] "موضوع" أكبر موقع عربي بالعالم

”قانون سے مراد ایسی بنیادوں اور قواعد کا مجموعہ ہے کہ معاشرے کی تنظیم کے لیے جن پر عمل کیا جاتا ہو۔“

عدل کی تعریف یہ ہے:

”العدل هو فصل الحكومة على ما في كتاب الله سبحانه وسنة رسوله، لا الحكم بالرأي المجرد[1] كقوله تعالى:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾(سورۃ النساء:58)

عدل سے مراد یہ ہے کہ ”حکومت محض شخصی رائے کے ساتھ فیصلہ کرنے کی بجائے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق فیصلہ کرے۔“

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ”اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل افراد کے سپرد کرو۔ اور جب لوگوں میں فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ ہی فیصلہ کرو۔“

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

”كِتَابُ اللهِ فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ، وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ، وَهُوَ الفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ... مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ، وَمَنْ عَمِلَ بِهِ أُجِرَ، وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ، وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هَدَى إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ“۔[2]

”یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں تم سے پہلے لوگوں کی خبریں ہیں، بعد میں آنے والوں کے لیے پیشین گوئیاں ہیں، تمہارے درمیان جھگڑوں کے فیصلے ہیں، یہ فیصل ہے، مزاح نہیں ہے۔... جس نے اس کی بات کی، اس نے سچ کہا، جس نے اس پر عمل کیا اس نے ثواب پالیا، جس نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف بلایا، اس نے سیدھے رستے کی طرف دعوت دی۔“

---

[1] فتح القدیر:1/480

[2] جامع الترمذي:رقم 2906، باب ماجاء في فضل القرآن

انصاف صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ فأولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (سورۃ المائدۃ:47)

''جولوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظلم کرنے والے ہیں۔''

شریعت کی تعریف مختلف انداز سے کی جاتی ہے، پہلے ہم وہ تعریف ذکر کریں گے جسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے پہلے شریعت کی حقیقی تعریف پھر بگڑی ہوئی تعریفوں کو واضح کیا ہے، اور بعد ازاں شریعت کی وہ تعریف ذکر کریں گے، جو پاکستان کے جملہ مکاتبِ فکر کے ہاں مسلمہ اور متفقہ ہے۔

شریعت کا لفظ مداہنت سے فقہ اور بگڑی ہوئی شریعت پر بھی بول دیا جاتا ہے لیکن اللہ کی نازل کردہ شریعت صرف کتاب وسنت ہی ہے چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لفظ 'الشرع' فی هذا الزمان يطلق على ثلاثة معان: شرع منزّل وشرع متأول وشرع مبدل... فالمنزل: الكتاب والسنة فهذا الذی يجب اتباعه على كل واحد ومن اعتقد انه لا يجب اتباعه على بعض الناس، فهو كافر۔

عصر حاضر میں لفظ شرع کا اطلاق تین معانی پر ہوتا ہے۔ شرعِ منزل، شرعِ متاول اور شرع مبدل:

شرع منزل سے مراد کتاب وسنت ہے جس کی اتباع کرنا ہر ایک پر واجب ہے اور جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ بعض لوگوں پر اس کی اتباع واجب نہیں ہے، وہ کافر ہے۔

گویا اجتہاد اگرچہ مشروع ہے لیکن کتاب وسنت سے مستنبط اجتہاد کا ثمرہ 'فقہ' کہلاتی ہے۔ شریعت محمدیہ میں حقیقی اختلاف نہیں ہوسکتا اس لیے وہ ایک ہی ہے مگر مجتہدین کا اختلاف بسا اوقات حقیقی ہوتا ہے اور پھر کتاب وسنت کی تعبیر تو عموماً متنوع ہوتی ہے اسی لیے فقہ میں تعدد لازمی ہے۔ فقہ حنفی، فقہ جعفری، فقہ زیدی، فقہ شافعی، فقہ مالکی اور فقہ ظاہری کے الفاظ کا استعمال علماء کے ہاں عام ہے جبکہ حنفی شریعت اور شافعی شریعت کا لفظ گوارا نہیں کیا جاتا۔ صدر محمد ضیاء الحق مرحوم کے زمانہ میں سینٹ میں پیش کردہ شریعت بل پر جب

اختلاف ہوا تو 1986ء میں اسے اتفاقی بنانے کے لیے مسلمانوں کے جملہ مکاتب فکر نے شریعت بل کی دفعہ(2)شق (ج) میں یہی تعریف کی تھی کہ ''شریعت سے مراد کتاب وسنت ہے''۔

مذکورہ بالا تفصیل سے علم ہوا کہ شریعت سے مراد صرف کتاب وسنت ہے اور فقہا کی آرا کو شریعت نہیں کہا جا سکتا۔

(د)نزولِ شریعت کا مقصد

شریعت کے نزول کا مقصد اللہ کی بندگی اور اطاعت کے ذریعے معاشرے میں عدل وانصاف کا قیام بھی ہے:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید:25)

''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔''

﴿وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ (سورۃ النساء:58)

''اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔''

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ، وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (سورۃ المائدۃ:8)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔''

اور وہی معاشرے ترقی پاتے ہیں جہاں عدل وانصاف کی حکومت ہو، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

''إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ،أَنَّهُمْ كَانُوا يُقِيمُونَ الحَدَّ عَلَى الوَضِيعِ وَيَتْرُكُونَ الشَّرِيفَ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ فَعَلَتْ ذَلِكَ لَقَطَعْتُ يَدَهَا''[1]

---

[1] صحيح البخاري: باب إقامة الحدود: رقم 6787

''تم سے پہلے کے لوگ اس لیے ہلاک ہو گئے کہ وہ کمزوروں پر تو حد قائم کرتے اور بلند مرتبہ لوگوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی (چور) کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ لیتا۔''

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام 'نظام القضاء في الدّول الإسلامية' (النظرية والتطبيق) کے عنوان سے بین الاقوامی کانفرنس کے مرکزی مباحث میں '' تشريع الأحكام القضائية في الاسلام'' (المصادر التي يجب أن يعتمد عليها القاضي في إصدار أحكامه) کو ملحوظ رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ پاکستان اور سعودی عرب کے عدالتی نظام کی قانونی حدود کے لیے پہلے دونوں دساتیر کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ دونوں دساتیر کی الگ الگ اسلامی خصوصیات کا ذکر کر کے، پہلے چند تقابلی نکات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ جس کے بعد دونوں اسلامی ممالک کے نظام القضاء کی چند خصوصیات کا ذکر اور تقابلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

پاکستانی اور سعودی دستور (نظام الحکم) کی اسلامی خصوصیات کا تجزیہ

کسی بھی ملک میں جاری قانونی نظام کے دو اہم پہلو ہیں:

ایک پہلو تو دستوری اور بنیادی قانون کے حوالے سے ہوتا ہے کہ اس میں اُصولی طور پر کیا کیا ضوابط قائم کیے گئے ہیں یہ نظام الحکم یا دستور کہلاتا ہے۔ جبکہ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس دستور و قانون یا انصاف کے حصول کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے گا، جس میں قاضی کون ہوں گے؟ کس طرح نظام قضا چلے گا، اور فیصلہ کس طرح ہوگا، اگر کسی فیصلہ میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہو تو نظر ثانی یا اپیل کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ اس کو نظام القضاء کہا جاتا ہے۔

اس وقت 1973ء میں منظور ہونے والا پاکستانی دستور ملک میں نافذ العمل ہے، جس میں اب تک 28 ترامیم بھی ہو چکی ہیں، یہ دستور 280 دفعات پر مشتمل ہے۔ جبکہ سعودی عرب میں نافذ العمل نظام الحکم (دستور)

یکم مارچ 1993ء کو نافذ کیا گیا، جس کے سات حصوں میں 80 دفعات ہیں، اس کے ساتھ ہی مجلس شوریٰ کا نظام بھی قائم کیا گیا جس کی 34 دفعات ہیں۔ ذیل میں ہر دو دساتیر کی اسلامی دفعات کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

پاکستانی دستور کی اسلامی دفعات

واضح رہے کہ پاکستانی نظام میں ایک قانون تو وہ ہے جو پارلیمنٹ کے ذریعے منظور ہوتا ہے، اور دوسرا قانون کا وہ حصہ ہے جسے شرعی عدالت یا دیگر عدالتیں اصل قانون کی وضاحت کرتے ہوئے متعین کرتی ہیں۔ ان ہر دو بنیادوں پر پاکستان کے مرکزی اور ذیلی قوانین میں اسلامی دفعات کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

1. **قراردادمقاصد**[1] (Objective Resolution) 12 مارچ 1949ء کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی تھی جو دستور کا دیباچہ ہی رہی تاہم 1977ء کے انقلاب کے بعد پاکستانی دستور کے آرٹیکل 2 کے بعد 2A کا اضافہ کر کے قرارداد مقاصد کو آئین کا لازمی حصہ مارچ 1985ء میں بنایا گیا تھا۔لیکن پاکستان کی سپریم کورٹ کے پانچ ججوں پر مشتمل فل بینچ نے جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں زیر سماعت **مقدمہ حاکم خان وغیرہ بنام حکومت پاکستان** میں بتاریخ 19 جولائی 1992ء فیصلہ کیا کہ آرٹیکل 2A کو دستور کے باقی آرٹیکل پر کوئی بالادستی حاصل نہیں ہے۔اس لیے پارلیمنٹ ہی دیگر آرٹیکلز میں ترمیم کر کے تضادات ختم کر سکتی ہے[2]۔

قراردادمقاصد کا اُردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

❀ اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے۔اس نے جمہور کے ذریعے مملکتِ پاکستان

---

[1] قراردادمقاصد بنام سپریم کورٹ آف پاکستان کا تجزیہ' منجانب سردار شیر عالم خان (ایڈووکیٹ)، مترجم چوہدری محمد یوسف (ایڈووکیٹ)، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ، اشاعت اول، 1994ء

[2] PLD 1992,Supreme Court 595 اور 'قراردادمقاصد بنام سپریم کورٹ آف پاکستان کا تجزیہ' منجانب سردار شیر عالم خان (ایڈووکیٹ)، مترجم چوہدری محمد یوسف (ایڈووکیٹ)، الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ، 1994ء

کو جو اختیار سونپا ہے، وہ اس کی مقررہ حدود کے اندر مقدس امانت کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

۞ مجلس دستور ساز نے جو جمہور پاکستان کی نمائندہ ہے، آزاد و خود مختار پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۞ جس کی رو سے مملکت اپنے اختیارات و اقتدار کو جمہور کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔

۞ جس کی رو سے اسلام کے جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدلِ عمرانی کے اُصولوں کا پورا اتباع کیا جائے گا۔

۞ جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو قرآن وسنت میں درج اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق ترتیب دے سکیں۔

۞ جس کی رو سے اس امر کا قرارِ واقعی اہتمام کیا جائے گا کہ اقلیتیں، اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھنے، عمل کرنے اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دینے کے لیے آزاد ہوں۔

۞ جس کی رو سے وہ علاقے جو اَب تک پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں، ایک وفاق بنائیں گے جس کے صوبوں کو مقررہ اختیارات و اقتدار کی حد تک خود مختاری حاصل ہوگی۔

۞ جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی اور ان حقوق میں جہاں تک قانون و اخلاق اجازت دیں، مساوات، حیثیت و مواقع کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی انصاف، اظہارِ خیال، عقیدہ، دین، عبادت اور جماعت کی آزادی شامل ہوگی۔

۞ جس کی رو سے اقلیتوں اور پسماندہ و پست طبقات کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرارِ واقعی انتظام کیا جائے گا۔

۞ جس کی رو سے نظامِ عدل گستری کی آزادی پوری طرح محفوظ ہوگی۔

۞ جس کی رو سے وفاق کے علاقوں کی صیانت، آزادی اور جملہ حقوق، بشمول خشکی و تری اور فضا پر صیانت کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا تاکہ اہلِ پاکستان فلاح و بہبود کی منزل پا سکیں اور اقوام عالم کی صف

میں اپنا جائز وممتاز مقام حاصل کریں اور امن عالم اور بنی نوع انسان کی ترقی وخوش حالی کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کرسکیں۔''

پاکستان کے دستور 1973ء میں جو مزید دفعات اسلامی کہی جاتی ہیں ان کا مختصر ذکر یوں ہے:

2۔ **آرٹیکل 29 سے 40 تک جو پالیسی کے اصول ہیں**، وہ بھی اسلامی تہذیب وتمدن کے فروغ پر مبنی ہیں اگرچہ آرٹیکل 30 کی شق 2 میں یہ واضح کردیا گیا ہے کہ انہیں کسی عدالت میں قانونی لزوم کے طور پر چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم قومی زبان اردو کے بارے میں سپریم کورٹ نے حال ہی میں آرٹیکل 251 کے تحت اہم فیصلہ کیا ہے جسے نافذ کرنے کے لیے وزیر اعلیٰ پنجاب نے نوٹیفکیشن کردیا ہے۔

3۔ **مسلم عائلی قوانین 1961ء**

4۔ **قادیانی غیر مسلم اقلیت 7/ستمبر 1974ء**

5۔ **ہائیکورٹوں میں شریعت بنچ 1979ء** [1]

6۔ **بدکاری کا انسداد 1962ء**

7۔ **حدود آرڈیننس 1979ء**

8۔ **سود کا خاتمہ... ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے سلسلے میں**

9۔ **وفاقی شرعی عدالت کا قیام... 26 مئی 1980ء**

10۔ **زکوٰۃ وعشر آرڈیننس... 20 جون 1980ء**

---

[1] جنہیں بعد میں وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ (شریعت اپلیٹ بنچ) میں ڈھال دیا گیا۔ اگرچہ اس میں سے اہم قوانین بشمول آئین، پرسنل لاز، مالیاتی قوانین (26 جون 90ء تک) اور عدالتوں وغیرہ کے طریقہ کار سے متعلق ضابطہ کے قوانین کو مستثنیٰ کردیا گیا۔ چونکہ اس غرض سے شرعی عدالت کے دائرہ کار کے بارے میں قانون کی تعریف (دستور کے باب 3/الف میں) یوں ہے:

203ب (ج) ''قانون میں کوئی رسم یا رواج شامل ہے جو قانون کا اثر رکھتا ہو مگر اس میں دستور، مسلم شخصی قانون، کسی عدالت یا ٹریبونل کے ضابطہ کار سے متعلق کوئی قانون یا اس بات کے آغازِ نفاذ سے دس سال کی مدت گزرنے تک کوئی مالی قانون یا محصولات یا فیسوں کے عائد کرنے اور جمع کرنے یا بنکاری یا بیمہ کے عمل اور طریقہ سے متعلق کوئی قانون شامل نہیں ہے۔''

11۔ نفاذِ شریعت آرڈیننس 15 جون 1988ء

12۔ حق شفعہ کے قانون کی بیشتر دفعات جو سپریم کورٹ آف پاکستان (شریعت اپلیٹ بنچ) کے فیصلہ 1986ء کی رو سے غیر اسلامی قرار پائیں۔

13۔ قصاص ودیت کے قانون کی 56 دفعات (جون 1990ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان (شریعت اپلیٹ بنچ) نے قرآن وسنت کے احکام کے منافی قرار دیں۔ اس فیصلہ میں یہ اہم امر بھی شامل کیا کہ اگر متعینہ مدت تک نیا قانون نافذ نہ کیا گیا تو قرآن وسنت کے احکامات براہ راست نافذ ہوں گے)

14۔ امتناعِ توہین رسالت کا قانون، 30/ اپریل 1991ء، شرعی عدالت کے فیصلے کی رو سے

15۔ بعض سودی قوانین جنہیں 26 جون 1990ء کے بعد 14/ نومبر 1991ء کو وفاقی شرعی عدالت نے غیر اسلامی قرار دیا تھا۔ لیکن اب تک اپیلوں اور ریمانڈ وغیرہ کے ذریعے حکومت نے سودی قوانین کو شریعت سے محفوظ کر رکھا ہے۔[1]

سعودی عرب کے دستور (نظام الحکم) کی اسلامی دفعات

سعودی دستور کی براہ راست نفاذ شریعت کے بارے میں اہم دفعات کا متن مع ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

1۔ "المادة الأولى: المملكة العربية السعودية دولة عربية إسلامية، ذات سيادة تامة، دينها الإسلام، ودستورها كتاب الله تعالى وسنة رسول الله، ولغتها هي اللغة العربية، وعاصمتها مدينة الرياض"۔

"آرٹیکل 1: مملکت سعودی عرب مکمل طور پر خود مختار عرب اسلامی ملک ہے، اس کا دین 'اسلام'، دستور 'کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'، زبان 'عربی' اور دار الحکومت 'الریاض' ہے۔"

---

[1] سپریم کورٹ آف پاکستان، (شریعت اپلیٹ بنچ) نے 23 دسمبر 1999ء کو اس فیصلہ کی توثیق کردی۔ جسے حکومت کے لیے نافذ کرنے کی آخری میعاد 30 جون 2002ء تھی۔ لیکن حکومت کی کوششوں سے شریعت اپلیٹ بنچ نے یہ فیصلہ ریمانڈ کر کے وفاقی شرعی عدالت کو واپس بھیج دیا۔ اسلامی بینکاری کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی کا مضمون روزنامہ جنگ: 9 مارچ 2017ء

2-''المادة السادسة:يبايع المواطنون المَلِك على كتاب الله تعالى وسنة رسوله،وعلى السمع والطاعة في العُسر واليسر والمنشط والمكره''۔

''آرٹیکل 6: ملک کے تمام شہری بادشاہ کی، کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر، نیز تنگی وخوشحالی اور پسند وناپسند، ہر صورت میں سمع وطاعت پر بیعت کریں گے۔''

3-''المادة السابعة: يستمدّ الحكم في المملكة العربية السعودية سلطته من كتاب الله تعالىٰ وسنة رسوله، وهما الحاكمان على هذا النظام وجميع أنظمة الدولة''۔

''آرٹیکل 7:حکومت کے ملک میں جملہ اختیارات کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنا پر ہوں گے،اور ان دونوں (کتاب وسنت) کو اس نظامِ حکومت اور ملک میں رائج دیگر تمام نظاموں پر بالادستی اور برتری حاصل ہوگی۔''

4-''المادة الثامنة: يقوم الحكم في المملكة العربية السعودية على أساس العدل والشورىٰ والمساواة وفق الشريعة الإسلامية'

''آرٹیکل 8: حکومت، شریعتِ اسلامی کے مطابق عدل وانصاف، شورائیت اور مساوات جیسے بنیادی اُصولوں پر قائم رہے گی۔''

5''المادة التاسعة:الأسرة هي نواة المجتمع السعودي، ويُربي أفرادها على أساس العقيدة الإسلامية وما تقتضيه من الولاء والطاعة لله ولرسوله ولأولى الأمر،واحترام النظام وتنفيذه وحبّ الوطن والاعتزاز به وبتاريخه المجيد''۔

''آرٹیکل 9:سعودی معاشرے کی بنیاد 'خاندان' ہے جس کے افراد کی تربیت اسلامی عقیدے کی بنیاد پر کی جائے گی ،جس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولوا الامر کی اطاعت وفرمانبرداری قبول کی جائے۔اسی طرح حکومت کے نافذ کردہ نظاموں کا احترام، وطن کی عزت ومحبت اور اس کی شاندار تاریخ کی بنیاد پر کیا جائے۔''

6 "المادة العاشرة: تحرص الدّولة على توثيق أواصر الأسرة، والحفاظ على قيمها العربية والإسلامية، ورعاية جميع أفرادها، وتوفير الظروف المناسبة لتنمية ملكاتهم وقدراتهم"۔

"آرٹیکل 10: حکومت، خاندان کے مابین تعلق کو مضبوط بنانے، اس کی عربی اور اسلامی اقدار کی حفاظت کرنے، اس کے تمام افراد کی دیکھ بھال اور ان کی اہلیتوں اور صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور ان سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کے لیے مناسب ماحول مہیا کرنے میں انتہائی طور پر کوشاں رہے گی۔"

7 "المادة الحادية عشرة: يقوم المجتمع السعودي على أساس من اعتصام أفراده بحبل اللہ، وتعاونهم على البر والتقوى، والتكافل فيما بينهم، وعدم تفرقهم"۔

"آرٹیکل 11: سعودی معاشرے کا قیام اس اساس پر ہوگا کہ اس کے تمام افراد اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں، نیکی اور پرہیزگاری کے اُصولوں پر ایک دوسرے سے تعاون کریں، باہم ایک دوسرے کا سہارا بنیں اور تفرقہ سے اجتناب کریں۔"

8 "المادة الثانية عشرة: تعزيز الوحدة الوطنية واجب، وتمنع الدولة كل ما يؤدي للفرقة والفتنة والانقسام"۔

"آرٹیکل 12: ملکی وحدت اور سالمیت کی حفاظت ہر سعودی شہری کا فرض ہے اور حکومت ہر ایسی کوشش سے روکے گی جو فرقہ بندی، فتنہ فساد اور انقسام پر منتج ہو۔"

9 "المادة الثالثة عشرة: يهدف التعليم إلى غرس العقيدة الإسلام في نفوس النشئ، وإكسابهم المعارف والمهارات، وتهيئتهم ليكونوا أعضاء نافعين في بناء مجتمعهم محبين لوطنهم معتزين بتاريخه"۔

"آرٹیکل 13: نئی نسل کے دلوں میں اسلامی عقیدے کی ترکیز و آبیاری، اسے علوم و فنون میں

مہارت حاصل کرنے کے لیے امداد مہیا کرنا اور اس طرح تیار کرنا کہ وہ اپنے معاشرے کی تعمیر میں نفع بخش ثابت ہو، اپنے وطن سے محبت اور اپنی تاریخ پر فخر کرے، تعلیم کے اہداف ہوں گے۔''

10 ''**المادة السابعة عشرة:** الملكية ورأس المال والعمل مقومات أساسية في الكيان الاقتصادي والاجتماعي، وهي حقوق خاصة تؤدي وظيفة اجتماعية وفق الشريعة الإسلامية.

''**آرٹیکل 17:** ملکیت، سرمایہ اور محنت... ملک کے اقتصادی اور اجتماعی ڈھانچے کی بنیادیں ہیں۔ یہ خاص (انفرادی) حقوق ہیں جو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق اجتماعی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔''

11 ''**المادة العشرون:** لاتفرض الضرائب والرسوم إلا عند الحاجة، وعلى أساس من العدل، ولايجوز فرضها أو تعديلها أو إلغاؤها أو الإعفاء منها إلا بموجب النظام''۔

''**آرٹیکل 20:** ٹیکس اور محصولات صرف ضرورت کے تحت اور منصفانہ بنیاد پر عائد کیے جائیں گے۔ ان کا عائد کرنا یا ان میں کوئی ترمیم، یا ان کو معاف کرنا وغیرہ صرف نظام کے مطابق عمل میں آئیں گے۔''

12 ''**المادة الحادية والعشرون:** تجبى الزكاة وتنفق في مصارفها الشرعية''۔

''آرٹیکل **21:** زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور اسے اس کے شرعی مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔''

13 ''المادة الثالثة والعشرون: تحمي الدولة عقيدة الإسلامية وتطبق شريعته، وتأمر بالمعروف وتنهى عن المنكر، وتقوم بواجب الدعوة إلى الله''۔

''**آرٹیکل 23:** حکومت، عقیدۂ اسلام کی حفاظت اور شریعتِ اسلامیہ کو نافذ کرے گی، اَمر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے گی اور دعوت الی اللہ کا اہتمام کرے گی۔''

14 ''المادة الرابعة والعشرون: تقوم الدولة بإعمار الحرمين الشريفين وخدمتها وتوفر الأمن والرعاية لقاصديهما، بما يمكن من أداء الحج والعمرة والزيارة بيُسرٍ وطمأنينة''۔

’’ **آرٹیکل 24:** حکومت، حرمین شریفین کی تعمیر اور ان کی خدمت کا فرض پورا کرے گی، ان کی طرف قصد کرنے والوں کے لیے امن وسلامتی اور ان کی دیکھ بھال کو یقینی بنائے گی تا کہ حج وعمرہ اورزیارتِ (مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اطمینان وسکون سے انجام پاسکیں۔ ‘‘

(15) ”**المادة الخامسة والعشرون:** تحرص الدولة على تحقيق آمال الأمة العربية والإسلامية في التضامن وتوحيد الكلمة وعلى تقوية علاقاتها بالدول الصديقة“.

’’ **آرٹیکل 25:** حکومت، عرب اور مسلم اُمت کے باہمی تعاون اور اتحاد کی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے انتہائی کوشاں رہے گی اور دوست ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات مستحکم کرے گی۔ ‘‘

(16) ”**المادة السادسة والعشرون:** تحمى الدولة حقوق الإنسان وفق الشريعة الإسلامية“.

’’ **آرٹیکل 26:** مملکت شریعتِ اسلامیہ کے مطابق حقوقِ انسانی کی حفاظت کرے گی۔ ‘‘

(17) ”**المادة السابعة والعشرون:** تكفل الدولة حق المواطن وأسرته في حالة الطواري والمرض والعجز والشيخوخة، وتدعم نظام الضمان الاجتماعي، وتشجع المؤسسات والأفراد على الإسهام في الأعمال الخيرية“.

’’ **آرٹیکل 27:** ہنگامی حالت، بیماری، معذوری اور بڑھاپے میں حکومت سعودی شہری اور اس کے خاندان کے حقوق کی کفالت، ’سوشل سیکورٹی‘ (تحفظِ عامہ) کے نظام کی مالی امداد اور فلاحی کاموں میں حصہ لینے والے اداروں اور افراد کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ ‘‘

(18) ”**المادة الثالثة والثلاثون:** تنشيء الدولة القوات المسلحة وتجهزها، من أجل الدفاع عن العقيدة والحرمين الشريفين والمجتمع والوطن“.

’’ **آرٹیکل 33:** حکومت مسلح افواج بنائے گی اور اُنہیں عقیدۂ اسلامیہ، حرمین شریفین، معاشرے اور وطنِ عزیز کے دفاع کے لیے تیار کرے گی۔ ‘‘

(19) ”**المادة الرابعة والثلاثون:** الدفاع عن العقيدة الإسلامية والمجتمع والوطن واجب

على كل مواطن، ويبين النظام أحكام الخدمة العسكرية“۔

”**آرٹیکل 34:** عقیدہ اسلامیہ، معاشرے اور وطن کا دفاع کرنا ملک کے ہر شہری پر لازم ہوگا۔ تاہم ایک الگ نظام فوجی خدمات کے دیگر اَحکام کو واضح کرے گا۔“

(20) ”**المادة الثامن والثلاثون:** العقوبة شخصية ولا جريمة ولاعقوبة إلا بناء على نص شرعي، أو نص نظامي، ولا عقاب إلا على الأعمال اللاحقة للعمل بالنص النظامي“۔

آرٹیکل 38: سزا فرد کا شخصی معاملہ ہے۔ کسی شرعی یا انتظامی خلاف ورزی کے بغیر کوئی فعل جرم قرار نہیں پائے گا، نہ اس پر سزا دی جاسکے گی اور سزا بھی اُسی فعل پر دی جائے گی جو اس کے متعلق جاری ہونے والے نظام کے بعد سرزَد ہو۔“

(21) ”**المادة الثالثة والأربعون:** مجلس الملك ومجلس ولي العهد، مفتوحان لكل مواطن ولكل مَن له شكوىٰ أو مظلمة، ومن حق كل فرد مخاطبة السلطات العامة فيما يعرض له من الشؤون“۔

”آرٹیکل **43:** بادشاہ اور ولی عہد کے ایوان ہر شہری اور ہر اس شخص کے لیے کھلے ہیں جسے کوئی شکایت ہو یا جس کا حق سلب کیا گیا ہو۔ نیز ہر شہری کو اپنے معاملات کے سلسلے میں متعلقہ حکام سے رجوع کرنے کا حق ہوگا۔“

(22) ”**المادة الخامسة والأربعون:** مصدر الإفتاء في المملكة العربية السعودية كتاب اللّٰه تعالىٰ وسنة رسول اللّٰه، ويبين النظام ترتيب هيئة كبار العلماء وإدارة البحوث العلمية والإفتاء واختصاصاتها“۔

”**آرٹیکل 45: مملکت میں فتویٰ دینے کا سرچشمہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ ہے۔ قانون کے ذریعے 'کبار علماء کونسل' اور 'ادارۂ بحوثِ علمیہ' کی ترتیب اور ان دونوں کے فرائض کو بیان کردیا جائے گا۔**

23 ”المادة السادسة والأربعون:القضاء سلطة مستقلة ولا سلطان على القضاة في قضائهم لغير سلطان الشريعة الإسلامية“۔

”آرٹیکل 46: ’عدلیہ‘ ایک آزاد اور با اختیار ادارہ ہوگا جس پر شریعتِ اسلامیہ کی بالادستی و برتری کے علاوہ اور کوئی بالادستی نہیں ہوگی۔“

24 ”المادة الثامنة والأربعون :تطبق المحاكم على القضايا المعروضة أمامها أحكام الشريعة الإسلامية وفقًا لما دلّ عليه الكتاب والسنة، وما يصدره ولي الأمر من أنظمة لا تتعارض مع الكتاب والسنة“۔

آرٹیکل 48: تمام عدالتیں پیش ہونے والے جملہ مقدمات میں شریعتِ اسلامیہ کے احکامات کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہوں گی جیسا کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے ثابت ہیں۔ نیز انتظامی عدالتیں حکام کی طرف سے نافذ کردہ اُن نظاموں کے مطابق فیصلہ کریں گی جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کے مخالف نہ ہوں۔“

25 ”المادة السابعة والستون:تختص السلطة التنظيمية بوضع الأنظمة واللوائح فيما يحقق المصلحة،أو يرفع المفسدة في شؤون الدولةوفقًا لقواعد الشريعة الإسلامية،وتمارس اختصاصاتها وفقًا لهذا النظام ونظامي مجلس الوزراء ومجلس الشوریٰ“۔

آرٹیکل 67: انتظامیہ کو شریعتِ اسلامیہ کے قواعد کے دائرے میں رہتے ہوئے ایسے ضوابط اور پروگرام بنانے کا اختیار حاصل ہوگا جو مصالح عامہ اور رفعِ مفاسد کے لیے معاون ثابت ہوں گے۔اسی طرح انتظامیہ اپنے خصوصی اختیارات، اس دستور، کابینہ اور مجلس شوریٰ کے نظاموں کے مطابق استعمال کرے گی۔“

پاکستان اور سعودی عرب کے دساتیر کے اسلامی آرٹیکلز کا ایک تقابلی جائزہ

1 کتاب وسنت کی براہِ راست تنفیذ یا ان کے حوالے سے بننے والے قانون کی:

سعودی عرب کا دستور ونظام براہِ راست کتاب وسنت کی تنفیذ ہے،[1] جبکہ پاکستانی دستور وقانون میں پارلیمنٹ کی بالا دستی[2] ہے۔حتیٰ کہ کتاب وسنّت سے مستنبط احکام کا تعین بھی پارلیمنٹ کا ہی مرہونِ منت ہے۔اور سپریم کورٹ کے فل بنچ کے فیصلے 1992ء کی رو سے ان اسلامی احکام کو دیگر دستوری دفعات پر کوئی بالا دستی حاصل نہیں ہوگی بلکہ اس کے منافی کسی دستوری آرٹیکل یا قانون کے تضاد کو دور کرنے کا اختیار صرف پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔کوئی عدالت ایسے تضاد کو ختم کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔

2 قرآن وسنت کے منافی قرار دینے کا اُلجھا طریق کار: دستور کے باب نہم (اسلامی احکام) آرٹیکل 227 تا 231 میں قرآن وسنت سے مستنبط احکام کے منافی کسی قانون کو کالعدم قرار دینے کی بات تو ضرور کہی گئی ہے، لیکن اس کو نافذ العمل کرنے کا طریق کار اس قدر طوالت اور اُلجھاؤ کا شکار ہے کہ ان مستنبط اسلامی احکام کا نفاذ بھی عملاً ایک خواب بن کر ہی رہ گیا ہے۔آرٹیکل 227(2) کا اردو ترجمہ یوں ہے:

''شق (1) کے احکام کو صرف اس طریقہ کے مطابق نافذ کیا جائے گا، جو اس حصہ [باب نہم] میں منضبط ہے۔''

3 انسانی حقوق کا براہ راست نفاذ جبکہ شریعت قانون سازی کی محتاج: پاکستانی دستور کے باب اوّل میں انسانی حقوق (آرٹیکل 8 تا 28) کو تو عدلیہ براہِ راست نافذ کرسکتی ہے اور جج اپنے فیصلے میں انسانی حقوق

---

[1] سعودی دستور (نظام الحکم) کے آرٹیکل نمبر 1، اور آرٹیکل نمبر 7 کے علاوہ مذکورہ بالا تمام آرٹیکل کا خلاصہ یہ ہے کہ سعودی نظام الحکم (دستور) کی رو سے خیر وشر اور حق وباطل کے پہلو سے شریعت کی مطابقت حکام وعوام کے لیے لازمی ہوگی، جبکہ انتظامی مصلحتوں کے بارے میں شریعت کے منافی ہونے کی شرط عائد ہے۔

[2] دستور کا آرٹیکل 2/اے: (یعنی قرار داد مقاصد میں بیان کردہ اصول اور احکام کو بذریعہ ہذا دستور کا مستقل حصہ قرار دیا جاتا ہے اور وہ بحسبہٖ مؤثر ہوں گے) اور 'مقدمہ حاکم خاں بنام حکومتِ پاکستان وغیرہ' میں سپریم کورٹ فل بنچ کا فیصلہ PLD 1992 Supreme Court 595,

کے منافی کسی قانون کا پابند نہیں ہے، لیکن شریعت کو قانون سازی کے ذریعے بالواسطہ ہی نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ سپریم کورٹ کے شریعت اپلیٹ بنچ نے شفعہ اور حدود وغیرہ کے بعض مقدمات میں یہ صراحت بھی کی کہ ''متبادل قانون نہ آنے کی صورت میں شرعی احکامات ہی براہِ راست نافذ العمل ہوں گے۔''

جبکہ باب اوّل میں مندرج حقوق کے حصول کے لیے ہائیکورٹ کے اختیارات سماعت پر کوئی پابندی نہیں ہے:

''199 ج (2): دستور کے تابع، حصہ دوم کے باب 1 میں تفویض کردہ بنیادی حقوق میں سے کسی حق کے نفاذ کے لیے کسی عدالت عالیہ سے رجوع کرنے کا حق محدود نہیں کیا جائے گا۔''

4 وفاقی شرعی عدالت سے اہم قوانین کا استثنا اور متبادل قوانین کے لیے پارلیمنٹ سے رجوع: شرعی عدالت کے اختیارات کے بارے میں دستور کے باب 3/الف کی رو سے دستور وغیرہ اہم قوانین کو مستثنیٰ کر کے فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ (شریعت اپلیٹ بنچ) بنایا گیا، تو اسے غیر محدود طول طویل سماعت کے بعد جن ذیلی قوانین کو کلی یا جزوی طور پر کالعدم قرار دینے کا اختیار دیا گیا، تو پھر بھی اصل قانونی اختیار پارلیمنٹ کو ہی حاصل رہا ہے۔ نتیجتاً دستور کے دونوں باب (3/الف اور باب نہم) عملاً غیر مؤثر ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ دستورِ پاکستان کے باب 3/الف (وفاقی شرعی عدالت) میں قانون کی تعریف کو یوں محدود کر دیا گیا ہے:

203ب (ج) ''قانون میں کوئی رسم یا رواج شامل ہے جو قانون کا اثر رکھتا ہو مگر اس میں دستور، مسلم شخصی قانون، کسی عدالت یا ٹریبونل کے ضابطہ کار سے متعلق کوئی قانون یا اس بات کے آغازِ نفاذ سے دس سال کی مدت گزرنے تک کوئی مالی قانون یا محصولات یا فیسوں کے عائد کرنے اور جمع کرنے یا بینکاری یا بیمہ کے عمل اور طریقہ سے متعلق کوئی قانون شامل نہیں ہے۔''[1]

---

[1] مالیاتی قوانین کے بارے میں دس سال کی مدت پوری ہونے کے بعد اب وفاقی شرعی عدالت کو مالی قوانین کے بارے میں اختیار سماعت حاصل ہو چکا ہے۔

جبکہ وفاقی شرعی عدالت کا مقصد 203د (3/الف) میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''اگر عدالت کی طرف سے کوئی قانون یا قانون کا کوئی حکم اسلامی احکام کے منافی قرار دے دیا جائے تو ...الف) وفاقی فہرست قانون سازی میں شامل کسی امر کے سلسلے میں کسی قانون کی صورت میں صدر یا کسی ایسے امر کے سلسلے میں مذکورہ فہرست میں سے کسی میں بھی شامل نہ ہو، کسی قانون کی صورت میں گورنر اس قانون میں ترمیم کرنے کے لیے اقدام کرے گا، تاکہ مذکورہ قانون یا حکم کو اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے۔

(3ب): مذکورہ قانون یا حکم اس حد تک جس حد تک اسے بایں طور منافی قرار دے دیا جائے، اس تاریخ سے جب عدالت کا فیصلہ اثر پذیر ہو، مؤثر نہیں رہے گا۔''[1]

5۔حکمتِ عملی کے اصول (اسلامی تہذیبی قوانین) فی الحال نافذ العمل نہیں: دستور کے باب 2 (حکمتِ عملی کے اصول، آرٹیکل 29 تا 40) کی رو سے اسلامی تہذیب وتمدن سے متعلق بعض اہم قوانین کو حکمتِ عملی کے اصولوں کو پالیسی کے طور پر پیش تو کیا گیا ہے تاہم اسی باب کے آرٹیکل 30 (شق 2) میں یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ مذکورہ پالیسی کے قوانین قابل نفاذ نہیں ہیں:

''کسی فعل یا کسی قانون کے جواز پر اس بنا پر اعتراض نہیں کیا جائے گا، کہ وہ حکمت عملی کے اصولوں کے مطابق نہیں ہے اور نہ اس بنا پر مملکت، مملکت کے کسی شعبے یا ہیئت مجاز یا کسی شخص کے خلاف کوئی قانونی کاروائی قابل سماعت ہوگی۔''

6۔کتاب وسنت سے متضاد ہونا یا اس کے مطابق ہونا؟ پاکستانی دستور کے اسلامی آرٹیکلز میں کسی قانون کے کتاب وسنت سے متضاد ہونے کی بات کہی گئی ہے، جبکہ سعودی عرب کے دستور (نظام الحکم) میں کسی بھی قانون کے لیے لازمی ہے کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق ہو یا اس سے ماخوذ ہو اور کتاب وسنت کے منافی ہونے کی بات صرف انتظامی اختیارات کے بارے میں ہے جن کو 'نظام' کا نام دیا جاتا ہے۔[2]

---

[1] صدارتی حکم نمبر 1، 1984ء...سیکشن: 2 (اے) مجریہ 14 فروری 1984ء

[2] سعودی دستور (نظام الحکم): آرٹیکل نمبر 1، 7 وغیرہ بالخصوص آرٹیکل نمبر 48

یہ مقالہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کی شریعہ اکیڈمی کے زیر اہتمام المصادر التي يجب أن يعتمد عليها القاضي في إصدار أحكامه کے موضوع پر تیار کیا گیا ہے، اس لیے اپنے مرحوم دوست بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے سابق صدر، وفاقی وزارتِ مذہبی امور کے سابق وزیر، اور وفاقی شرعی عدالت کے سابق جج ڈاکٹر محمود احمد غازی کے افکار کی یاددہانی کی غرض سے ان کی تحریر سے متعلقہ اقتباسات پیش کرتا ہوں:

ڈاکٹر محمود احمد غازی سعودی عرب کے نفاذِ شریعت کے ماڈل کو اسلامی دنیا میں نفاذ شریعت کا کامیاب ترین تجربہ قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں سعودی عرب میں دنیا بھر سے زیادہ امن وامان بھی پایا جاتا ہے، آپ لکھتے ہیں:

''اس معاملے میں غالبًا واحد استثنا برادر ملک سعودی عرب کا ہے جہاں اسلام کے فوجداری قوانین انتہائی مؤثر انداز میں نافذ ہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ حدود اور اسلام کے فوجداری قوانین کا جتنا مؤثر نفاذ سعودی عرب میں ہوا ہے، اتنا مؤثر نفاذ دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہوا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کے حدود اور فوجداری قوانین کے ثمرات وقتًا فوقتًا بیان کیے جاتے رہے ہیں، جن کی وجہ سے اسلام کے قوانین حدود کو مؤثر سمجھا جاتا رہا، اس کی واحد کامیاب مثال ابھی تک برادر ملک سعودی عرب ہی ہے۔ بقیہ ممالک میں حدود کے قوانین کا تجربہ یا تو مختلف اسباب کی بنا پر جزوی طور پر کامیاب رہا یا اس کی کامیابی اور ناکامی کا علمی اعتبار سے جائزہ نہیں لیا گیا۔''[1]

اس کے بالمقابل ڈاکٹر غازی پاکستان میں جاری شریعت کی قانون سازی کے تجربے کو فوری سہولت اور وقتی مجبوری کے تحت اختیار کرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ تجربہ تو وہ تھا جو پاکستان میں سامنے آیا۔ لیکن اس تجربے کی کمزوریوں یا اس میں غلطیوں کے باوجود کم از کم شخصی قوانین کی حد تک پاکستان میں آیا اور پاکستان کے علاوہ متعدد مسلم ممالک میں عدم تقنین کا تجربہ

[1] علم اصول فقہ، ایک تعارف: ج3/ص168

خاصی کامیابی سے جاری ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شخصی قوانین پر اُردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں کثرت سے مواد دستیاب ہے۔ ان احکام پر گزشتہ دو سو، ڈھائی سو سال سے مسلسل عمل ہو رہا ہے اور کیس لاء پر اتنا مواد اور نظائر (Precedents) تیار ہو گئے ہیں کہ اب کسی نئی صورت حال کا پیش آنا انتہائی شاذ و نادر حالات میں ہوتا ہے جس کے لیے اعلیٰ عدالتیں فیصلہ دے کر ایک نئی نظیر قائم کر دیتی ہیں۔"[1]

سعودی اور خلیجی ممالک کے نظام کی کامیابی اور اثر پذیری کو تسلیم کرتے اور پاکستان میں جاری قانونی طریقہ کار کو فوری سہولت قرار دینے کے بعد ڈاکٹر محمود غازی لکھتے ہیں کہ درحقیقت تدریجاً ایک مثالی اور بہتر نظام کی طرف پیش قدمی بہر طور ضروری ہے:

"حکومتِ وقت یا قانون ساز ادارہ ایک نقطہ نظر کو لازم اور واجب التعمیل قرار دے اور اس کی بنیاد پر ایک فیصلہ متعین کر دے جس کی روشنی میں قانون کی تدوین کی جائے۔ (صفحہ 173)

جس کی موجودگی کسی بھی اسلامی دستور کے لیے ناگزیر ہے اور کون سی چیز وہ ہے جو محض انتظامی نوعیت کی ہے، جس کی حیثیت وقتی ہوگی۔ (صفحہ 164)

جب ایسا نظامِ تعلیم کام شروع کر دے گا اور ایسے متخصّصین سامنے آنے شروع ہو جائیں گے، اس وقت شاید یہ کہا جا سکے گا کہ قوانین شریعت کو مدوّن اور ضابطہ بند کرنے کی ضرورت ہو ختم ہوگئی ہے لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا اور ملک کے عام قانون داں، وکلاء اور جج صاحبان احکام شریعت سے براہ راست واقفیت رکھنے والے کثیر تعداد میں دستیاب نہ ہوں، اس وقت تک عدم تقنین یا مختصر تقنین سے نفاذ شریعت کے تقاضے پورا کرنا انتہائی مشکل کام معلوم ہوتا ہے۔"[2]

---

[1] ایضاً: صفحہ 175

[2] ایضاً: صفحہ 175

سعودی اور پاکستانی نظام قضا کی خصوصیات اور تقابلی جائزہ

بلاشبہ عدالتی نظام کا مقصد فریقین کے مابین متنازعہ حقوق کے بارے میں ''حق بحق دار رسید'' ہوتا ہے۔مزید برآں بنیادی حقوق (مذہب، جان، عقل، نسل اور مال وغیرہ) کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ کمزور فریق پر طاقتور فریق کی زیادتی کا ازالہ کیا جائے۔ پاکستانی نظام میں اگرچہ بڑی ذمہ داری عدلیہ پر ڈالی گئی ہے، تاہم سرکاری ملازمین کے ناجائز اختیارات کے ازالہ کے لیے سویڈن سے درآمدہ ایک نظامِ احتساب Ombudsman بھی رائج ہے۔لیکن قانون کا تصوّر زیادتی کرنے والے کو سزا دے کر صرف تحفظ دینے تک محدود ہے۔

دوسری طرف سعودی عرب کا نظام انصاف اسلامی تاریخ کے تسلسل میں تین متوازی رمربوط اداروں پر مشتمل ہے۔چنانچہ عدلیہ کے علاوہ دو اہم ادارے الحسبۃ (هيئة الامر بالمعروف والنهي عن المنكر) اور دیوان المظالم بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ شریعت کا مقصد سزا کے ذریعے صرف دُکھ دینے کا نہیں بلکہ فرد و معاشرہ کو اس طرح سنوارنا ہے کہ وہ نہ صرف ایک دوسرے کے حقوق سلب نہ کریں، بلکہ سزا کے ذریعے معاشرے کو امن و امان کو گہوارا بنا دیا جائے۔عربی زبان کے لفظ 'تعزیر' کا مفہوم 'معاشرتی برائیوں کا علاج کر کے استحکام پیدا کرنا' ہے۔اس لیے تادیب (ادب وسلیقہ سکھانا) کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ شریعت صرف قانون نہیں ہے بلکہ حقوق و فرائض دونوں کا مجموعہ ہے۔لہٰذا جب تک فرد اور معاشرے کی تربیت نہ کی جائے، حقوق کا تحفظ اور امن و امان قائم نہیں ہوسکتا۔ اسی غرض سے نظام احتساب (هيئة الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر) کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں بھلائی کو فروغ ملے اور برائیوں کا خاتمہ ہو۔ یہ ایک خودکار نظام ہے جو شکایت کنندہ کے بغیر بھی جاری و ساری رہتا ہے۔عبادات کے علاوہ اخلاق و معاملات کے وسیع دائرہ کی اصلاح اسی نظام احتساب کی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح دیوانِ مظالم کا بڑا مقصد اختیارات کے حامل افسروں اور عہدیداروں کی کڑی نگرانی ہے۔

جس میں نظام احتساب کے افسران اور عدلیہ کے عہدیداران کے غیر محدود اختیارات کی حامل زیادتیوں کا ازالہ بھی کیا جاتا ہے۔Check & Balance کے دو مستقل اور متوازی نظاموں کے وسیع دائرہ کار کی وجہ سے عدلیہ پر زیادہ دباؤ نہیں رہتا بلکہ عام عدالتوں سے صرف وہ لوگ رجوع کرتے ہیں، جو نظام احتساب اور دیوان المظالم سے انصاف حاصل نہ کرسکیں۔

واضح رہے کہ دیوان المظالم حکومت کی پوری مشینری کے علاوہ Administrative Courts کی صورت ایک مستقل عدالتی نظام بھی رکھتا ہے۔(اس کا ذکر عدالتی نظام کے ضمن میں آرہا ہے)

فی الحال مقالہ مختصر کرنے کے لیے نظام احتساب اور دیوان المظالم دونوں پر تبصرہ نہیں کیا جارہا بلکہ صرف عام سعودی اور پاکستانی عدالتی نظام کی چند ایک خصوصیات کا جزوی تقابلی مطالعہ ہی پیش کیا جاتا ہے البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ عدلیہ کے فیصلوں کی مؤثر تنفیذ کے لیے بھی تقریباً تین سال قبل سعودی عرب نے المحاکم المختصة للتنفیذ کے نام سے مزید نظام قائم کیا ہے (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے)۔سعودی عرب کے عدالتی نظام اور پاکستان کے عدالتی نظام کی خصوصیات عربی زبان میں مقالہ کے ضمیمہ کے طور پر منسلک ہیں جبکہ ذیل میں صرف ان کا خلاصہ اُردو زبان میں پیش کیا جاتا ہے:

1 عدالتی ڈھانچہ: انصاف کے عمل کو آسان اور یقینی بنانے کے لیے سعودی نظام عدل میں مقدمات کی نوعیت کے مطابق عدالتوں کی تقسیم اور درجہ بندی کی گئی ہے جیسا کہ نظام عدل 1428ھ کا آرٹیکل نمبر 9 اور 51 اس کی صراحت کرتا ہے۔ چنانچہ سعودی عرب میں مقدمات کی نوعیت کے اعتبار سے محاکم الدرجة الأولی (درجہ اوّل کی عدالتیں) پانچ طرح کی ہیں:

(ا) المحاکم العامة (جنرل عدالتیں)

(ب) المحاکم الجزائیة (کریمنل کورٹس)

(ج) محاکم الأحوال الشخصیة (پرسنل لاز کورٹس)

(د) المحاکم التجاریة (بزنس کورٹس)

(ھ) المحاکم العمالیة (لیبر کورٹس)

ہر طرح کی عدالتوں کی اپیل کے لیے محاکم الاستیناف (ہائی کورٹس) اور المحکمۃ العلیا (سپریم کورٹس) بھی موجود ہیں۔ جن کو مجلس القضاء الأعلیٰ (سپریم جوڈیشل کونسل) کنٹرول کرتی ہیں جبکہ نظام دیوان المظالم کی بھی ادنیٰ سے اعلیٰ سب عدالتوں پر پوری نگرانی ہوتی ہے۔ دیوان المظالم کی عدالتوں کو المحاکم الإداریۃ (Administrative Courts) کہتے ہیں۔ جن کی اُسی طرح ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ بندی ہے یعنی

المحاکم الإداریۃ پر محاکم الاستیناف الإداریۃ (Administrative High Courts) اور المحکمۃ الإداریۃ العُلیا (Administrative Supreme Courts) موجود ہیں۔

ان کو مجلس القضاء الإداري (Supreme Administrative Judicial Council) کنٹرول کرتی ہے۔

مزید برآں سعودی عرب میں تقریباً پانچ سال قبل 13 / شعبان 1433ھ کو عدالتی فیصلوں پر عمل درآمد کے لیے تیسری قسم کی تنفیذی عدالتوں کا ایک معاون نظام بھی قائم کیا گیا ہے۔ جسے دو سال بعد 22 / رمضان 1435ھ (20 / جولائی 2014ء) کو المحاکم المتخصّصۃ للتنفیذ Special Enforcement Courts کے نام سے مستقل حیثیت دے دی گئی ہے تاکہ فیصلوں پر فوری اور مؤثر عمل درآمد ہو سکے۔

2 **سعودی نظام عدل جدید ترین خطوط پر استوار ہے،** اور پوری دنیا کے ایسے جدید ترین تکنیکی وسائل اور سہولیات سے استفادہ کرتا ہے جو شریعتِ مطہرہ کے مخالف نہ ہوں۔

3 **سعودی نظام عدل فریقین (سعودی شہری اور غیر ملکی باشندوں) کو اپنا ہر مسئلہ پیش کرنے یا فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کرنے کا مکمل حق دیتا ہے،** چاہے براہ راست فریقین اپنا مقدمہ پیش کریں یا وکیل کی مدد حاصل کریں۔ جیسا کہ نظام عدل کا آرٹیکل 47 یہ قرار دیتا ہے کہ

”حق التقاضي مكفول بالتساوي للمواطنين والمُقيمين في المملكة،ويُبين النظام الإجراءات اللازمة لذلك“۔

''مطالبہ اور استحقاق پیش کرنے کا حق سعودی عرب میں تمام شہریوں اور تارکین وطن کو برابر حاصل ہے جس کا طریقہ کار متعلقہ نظام میں وضاحت سے پیش کر دیا گیا ہے۔''

4 **سعودی نظام عدل ایسے انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت بھی دیتا ہے جو قرآن وسنت کے مخالف نہ ہوں۔** جیسا کہ آرٹیکل نمبر 26 قرار دیتا ہے کہ

''تحمي الدولة حقوق الإنسان، وفق الشريعة الإسلامية''۔

''حکومت شریعت کے مطابق تمام انسانی حقوق کے تحفظ کی ضامن ہے۔''

5 **عدالتی طریقہ کار:** سعودی نظام عدل میں حقوق کی حفاظت اور زیادتی کے ازالہ کے لیے فیصلے کا میزان اور اس کے طریق کار (Procedural System) کے لیے حتمی معیار کتاب وسنت ہی ہیں، تمام فیصلہ جات اور نظاموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب وسنت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوں جیسا کہ سعودی دستور کا آرٹیکل نمبر 1 اور نمبر 7 اسی کا تقاضا کرتے ہیں۔

F نظام عدل پر حکام کا اثر ورسوخ بھی انہی اختیارات تک محدود اور مشروط ہے، جو کتاب وسنت نے اُنہیں دیے ہیں اور وہ نفاذِ شریعت، نظامات، عوام الناس کے مصالح اور ملک کے تحفظ و دفاع کے نگران و ذمہ دار ہیں جیسا کہ آرٹیکل نمبر 55 میں اس کو واضح کیا گیا ہے۔ اور آرٹیکل نمبر 50 یہ تقاضا کرتا ہے کہ بادشاہ اور اس کے مقرر کردہ حکام شرعی اور عدالتی نظام کے نفاذ کے ذمہ دار ہوں گے۔

پاکستانی جوڈیشل سسٹم (نظامِ قضا) کے منتخب حصے

1 پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کے جج حضرات کی نگرانی کے لیے دستور کے آرٹیکل نمبر 209 میں 'سپریم جوڈیشل کونسل' کا ذکر ہے:

''پاکستان کی ایک اعلیٰ عدالتی کونسل ہوگی، جس کا حوالہ اس باب میں کونسل کے طور پر دیا گیا ہے۔ جو چیف جسٹس آف پاکستان، سپریم کورٹ کے دو سینئر ترین ججز اور ہائیکورٹس کے دو سینئر ترین ججز پر مشتمل ہوگی۔''

209(8): ''کونسل ایک ضابطہ اخلاق جاری کرے گی جس کو عدالتِ عظمی اور عدالت ہائے عالیہ کے جج ملحوظ رکھیں گے۔''

2 پاکستانی دستور میں ماتحت عدالتوں کے فیصلوں پر نگرانی / اپیل کی سہولت مہیا کی گئی ہے اور اعلیٰ عدالتوں کے لیے ایک اہم اختیار Writ System کا بھی ہے جن سے گزر کر آخری فیصلہ سپریم کورٹ (عدالتِ عظمیٰ) کا ہوگا۔ **جیسا کہ سپریم کورٹ کو دستور کا آرٹیکل 185 یہ اختیار دیتا ہے کہ**

''اس آرٹیکل کے تابع عدالتِ عظمیٰ کو کسی عدالتِ عالیہ کے صادر کردہ فیصلوں، ڈگریوں، حتمی احکام یا سزاؤں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرنے اور ان پر فیصلہ صادر کرنے کا اختیار ہوگا۔''

3 اور ہائی کورٹ کو دستور کا آرٹیکل 201 اور 203 یہ اختیار دیتا ہے کہ

201: ''آرٹیکل 189 کے تابع کسی عدالت عالیہ کا کوئی فیصلہ، جس حد تک کہ اس میں کسی امر قانونی کا تصفیہ کیا گیا ہو یا وہ کسی اصول قانون پر مبنی ہو یا اس کی وضاحت کرتا ہو، ان تمام عدالتوں کے لیے واجب التعمیل ہوگا جو اس کے ماتحت ہوں۔''

203: ''ہر عدالت عالیہ اپنی ماتحت عدالتوں کی نگرانی اور انضباط کرے گی۔''

4 پاکستانی دستور میں مختلف عدالتوں کے جج حضرات کی بنیادی اہلیت یہ ہے:

آرٹیکل 177(1): سپریم کورٹ کے چیف اور جج کو صدرِ پاکستان یوں مقرر کرے گا کہ

(2 الف) کم از کم پانچ سال تک یا مختلف اوقات میں اتنی مدت تک جو مجموعی طور پر پانچ سال سے کم نہ ہو، کسی عدالتِ عالیہ کا جج رہا ہو (ب) کم از کم پندرہ سال تک یا مختلف اوقات میں اتنی مدت تک جو مجموعی طور پر 15 سال سے کم نہ ہو، کسی عدالت عالیہ کا ایڈووکیٹ رہا ہو۔''

آرٹیکل 193: ہائی کورٹ کے جج کے لیے پاکستان کا شہری اور 45 سال عمر ہونا ضروری ہے۔

(الف) 10 سال تک ہائی کورٹ کا ایڈوکیٹ رہا ہو۔ یا

(ب) 10 سال سول سروس کی ہو، جس میں تین سال ڈسٹرکٹ جج بھی رہا ہو۔ یا

(ج) دس برس تک پاکستان میں عدلیہ کا عہدیدار رہا ہو۔

جبکہ وفاقی شرعی عدالت کے جج کی اہلیت دستور کے آرٹیکل 203 ج میں مذکور ہے:

یہ عدالت چیف جسٹس سمیت 8 ججوں پر مشتمل ہوگی۔ (3 الف) ''ججوں میں سے زیادہ سے زیادہ چار ایسے اشخاص ہوں گے جن میں ہر ایک کسی عدالت عالیہ کا جج ہو یا رہ چکا ہو یا بننے کا اہل ہو۔ اور زیادہ سے زیادہ تین علماء ہوں گے جو اسلامی قانون، تحقیق یا تعلیم میں کم از کم پندرہ سالوں کا تجربہ رکھتے ہوں۔''[1]

گویا پاکستانی قانون میں جج کے لیے شرعی علوم کی مہارت بلکہ معرفت ہونا بھی ضروری نہیں۔ اگر ہے بھی تو وہ شرعی عدالت تک محدود ہے۔

5 پاکستانی نظام قضا میں سابقہ عدالتی نظائر کی قانونی حیثیت یہ ہے:

آرٹیکل نمبر 189: ''عدالتِ عظمی کا کوئی فیصلہ، جس حد تک کہ اس میں کسی امر قانونی کا تصفیہ کیا گیا ہو، یا وہ کسی اصول قانون پر مبنی ہو یا اس کی وضاحت کرتا ہو، پاکستان میں تمام دوسری عدالتوں کے لیے واجب التعمیل ہوگا۔''

اور ہائیکورٹ کی ماتحت عدالتوں پر نگرانی اور اس کے فیصلوں کی پابندی پر دستور کا آرٹیکل 201 تا 203 صراحت کرتے ہیں، جیسا کہ ان کا متن اوپر گزر رہا ہے۔

[1] دستور (اٹھارویں ترمیم) ایکٹ 2010 (نمبر 10 بابت 2010) کی دفعہ 74 کی رو سے بعض الفاظ تبدیل کیے گئے۔

سعودی اور پاکستانی نظام قضا (عدالتی نظام) کا تقابلی تجزیہ

1 کتاب وسنت کی بالادستی یا قانون کی: سعودی عرب میں جج پر صرف کتاب وسنت کی بالادستی [1] ہے، جبکہ پاکستان میں وہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا پابند ہے [2]۔ یعنی سعودی عرب میں عدلیہ کا مقصد انسانی حقوق کے سلسلے میں انصاف کا حصول اور زیادتی کا ازالہ ہوتا ہے، جبکہ پاکستان میں قانون کا نفاذ برتر حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ خواہ انصاف ملے یا نہ ملے کیونکہ پاکستان میں قانون وضع کیے بغیر کوئی شے نافذ العمل نہیں ہوتی۔

2 حق اور سچ کی تلاش یا خصومانہ نظام: سعودی عرب کا عدالتی نظام، مزاج کے لحاظ سے حق اور سچ کی تلاش ہے جس کی پوری ذمہ داری ججوں پر عائد ہوتی ہے جبکہ پاکستان کا عدالتی نظام خصومانہ Adversary System ہے۔ لہٰذا دونوں پارٹیوں کے بھرپور مقابلے کے درمیان جج کا کردار صرف ریفری کا ہوتا ہے۔ اصل مقابلہ فریقین کے بجائے وکیلوں کا ہوتا ہے جو کبھی نہیں ہارتے کیونکہ ان کو ہر صورت میں بڑی سے بڑی فیس مل جاتی ہے۔

1 ایڈورسری سسٹم کا قانون طریق کار کے ضمن میں آتا ہے، جس کا علم صرف ماہرین قانون کو ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں وکیل کے سوا کسی کی بات سنی نہیں جاتی اور قانون کی تشریح بھی وکیل کی ہی معتبر ہے جو اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کی نشاندہی کے ذریعے اپنی تشریح کو قانونی شکل دیتا ہے۔ مقدمہ کی طوالت میں بار اور بینچ کی باہمی مفاہمت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے عدالتیں وکلا کو پورا موقع دیتی ہیں کہ وہ کب متعلقہ قانونی تیاری مکمل کر کے بحث کریں۔

2 سعودی عرب میں گواہ کا معیاری ہونا ضروری ہے، جس کا ذریعہ تزکیة الشھود [3] ہے، جبکہ پاکستان میں گواہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ سزا یافتہ نہ ہو۔ گواہی کی سچائی اور جھوٹ کا فیصلہ مخالف وکیل کی جرح سے تضاد کی صورت میں مدعا علیہ اور ملزم کے حق میں جاتا ہے۔ یہ سارا کام وکیل کا ہی ہے۔ مقولہ مشہور

[1] سعودی دستور (نظام الحکم) کا آرٹیکل نمبر 46 اور 7... نظام القضاء کا آرٹیکل نمبر 1

[2] مقدمہ 'حاکم خاں بنام حکومت پاکستان وغیرہ'، پی ایل ڈی 1992، ایس سی 595، فیصلہ فل بنچ سربراہی: جسٹس نسیم حسن شاہ

[3] سعودی اور پاکستانی نظام میں گواہی سے متعلقہ قوانین

ہے: ''ملزم قانون کا لاڈلا بیٹا ہے''۔

3 اعلیٰ عدالتوں کے جج حضرات اور معروف قانون دان تو پاکستان کے Adversary System سے واقف ہیں لیکن انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کی شریعہ اکیڈمی نے دسمبر 2015ء میں سعودی عدالتی نظام کے جائزے کے لیے جوڈیشل مجسٹریٹ، سول ججز اور ایڈیشنل سیشن ججز پر مشتمل 24 رکنی وفد بھیجا تھا جس کی رپورٹ شریعہ اکیڈمی نے حال ہی میں شایع کی ہے۔ ان جج حضرات میں سے ایک جوڈیشل مجسٹریٹ ذیشان منظور کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

The Judicial System in KSA as I understood is inquisitorial in nature.Judges take Pains to search for truth rather acting as referees as happens in an adversarial systems.[1]

3 **جج کی اہلیت شرعی مہارت یا قوتِ فیصلہ:** حق وسچ کی تلاش جج کا کام ہے، اس لیے سعودی عرب میں کتاب وسنت کی مہارت کے حامل حضرات ہی جج بنائے جاتے ہیں جو کلیات الشریعۃ کی اعلیٰ ڈگریوں کے علاوہ سپریم جوڈیشل کونسل کے منعقدہ مقابلہ کے تقریری اور تحریری امتحان سے بھی گزرتے ہیں اور پھر ان کو ایک سال سے لے کر تین سال تک کی تربیت [2] بھی دی جاتی ہے۔ جبکہ پاکستان میں جج بننے کے لیے ایل ایل بی تو شرط ہے لیکن کتاب وسنت کی مہارت کی کوئی پابندی نہیں، بلکہ ملکی قانون سے واقفیت اور عدالتوں میں اس کا تجربہ [3] اہمیت رکھتا ہے۔

4 **دونوں ممالک میں سابقہ نظائر کی قانونی حیثیت:** جج کی صلاحیت لازماً کتاب وسنت کی مہارت ہے حتی کہ پیش آمدہ مقدمہ میں وہ عدالتی نظائر سے استفادہ تو کرتا ہے لیکن ان کا پابند نہیں ہوتا [4]، یعنی موقع پر

---

[1] Visit of Pakistani Judicial Officers, Shariah Academy, IIUI, 2016,p.28

[2] سعودی عرب کا نظام القضا 1428ھ، آرٹیکل 44

[3] پاکستانی دستور میں جج کی اہلیت کے لیے دیکھیں: آرٹیکل نمبر 193

[4] خصائص النظام السعودی میں المادۃ الخامسۃ اور پاکستانی ججز کے وزٹ میں شریعہ اکادمی کی رپورٹ: ص 7 "وأنه يحق للقاضي أن يلغي أي قانون أو حكم من أحكام القانون إن وجد مخالفا للقرآن الكريم أو للسنة النبوية."

اجتہاد کرتا ہے۔ جبکہ پاکستانی آئین اور قانون کی تشریح نہ صرف قانون دان کرتے ہیں، بلکہ ادنیٰ عدالتیں، اعلیٰ عدالتوں کے نظائر کی پابند[1] ہوتی ہیں۔

5 فیصلہ کا دورانیہ اور سماعتوں کی تعداد: دورانیہ کے بارے میں سعودی عدالتوں کا معمول یہ ہے کہ 3 ماہ کے اندر اندر زیادہ سے زیادہ پانچ سماعتوں میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے جب کہ اپلیٹ کورٹ میں بھی ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہیں لگتا۔ جیسا کہ متذکرۃ الصدر وفد کے ایک رکن جج کا تبصرہ یوں ہے:

That each civil case is decided in two to five sessions and that if the complainant or the defendant is not satisfied with the decision of the court, he or she may appeal to the Appellate Court within 30 days…

Whereas a criminal case if appealed to the Appellate Court for Criminal Case[2] may be decided only in one month.

We were told by the Head of the Criminal Court that the Court of Appeal will decide it in the very first hearing, thus, the total Time for the whole trial in both courts would be less than three months. This makes the justice system one of the fastest and the best in the world.[3]

چوں کہ سعودی عرب میں نظام احتساب کے علاوہ تین طرح کے مستقل عدالتی نظام بھی چل رہے ہیں اور ہر نظام میں شہروں اور ان کے حلقوں کے حساب سے ججوں کی ایک بہت بڑی تعداد کام کرتی ہے اس لیے ایک جج کے پاس یومیہ 5 تا 8 کیس ہوتے ہیں جبکہ پاکستان میں Adversary System کی وجہ سے طول طویل Litigation ہوتی ہے اس لیے ہر جج کے پاس یومیہ 80 تا 100 کیس لگتے ہیں جن میں

---

[1] پاکستانی دستور کا آرٹیکل نمبر 189

[2] Visit of Pakistani Judicial Officers, Shariah Academy, IIUI, 2016,p.6,7

[3] Ibid, p.17

وکلا کی مصروفیت کی بنا پر اکثر کی سماعت ہی نہیں ہو پاتی ۔مقولہ مشہور ہے کہ ’’انصاف کی تاخیر بھی ظلم ہے!‘‘ ایسا ہی ایک اور مقولہ ہے کہ ’’انصاف کا عملاً وجود کافی نہیں بلکہ انصاف ہوتا نظر آنا چاہیے۔‘‘ اسی طرح سعودی عرب میں عدالتی فیصلہ کی زیادہ سے زیادہ پانچ پیشیاں ہوتی ہیں، جبکہ پاکستان میں ان کی کوئی حد مقرر نہیں اور ادنیٰ عدالت سے لے کر اعلیٰ ترین عدالت کے فیصلوں تک بسا اوقات تین نسلیں بھی گزر جاتی ہیں۔ اسی لیے پاکستان میں بااثر پارٹیاں قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر فیصلہ کرنے کو ترجیح دیتی ہیں جس کی بنا پر کمزور یا تو معافی مانگنے پر مجبور ہوتا ہے یا برائے نام پونجی کا لولی پاپ اس کے ہاتھ تھما کر اسے ’’صلح‘‘ کا نام دیا جاتا ہے۔ ورنہ کمزور ہمیشہ ’’جرم کی سزا ہے مرگِ مفاجات‘‘ کا شکار رہتا ہے۔

عام طور پر اعلیٰ عدالتوں کے ریٹائرڈ جج حضرات تو خاموش رہتے ہیں لیکن ہائی کورٹ سے ریٹائرڈ ہونے والے وہ جج جو اب سپریم کورٹ میں وکالت کرتے ہیں، نے قتل کے بعض کیسوں کے بارے میں یوں تبصرہ کیا کہ یہاں سب سے بڑی مصیبت ’’وکالت‘‘ ہے۔

اس بارے میں چند نکات ملاحظہ ہوں:

(الف) پاکستان میں بینچ اور بار دونوں بظاہر قانونی نکتوں کی تلاش اور ان کے فیصلوں کے لیے مقدمات کی طوالت کا بہانہ کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جج حضرات اور وکلا کا تو کوئی نقصان نہیں ہوتا کیوں کہ ججوں کی مراعات اور وکلا کی بھاری بھرکم فیسیں انھیں مل جاتی ہیں لیکن پارٹیاں مسلسل Litigation کے اضافہ میں الجھتی چلی جاتی ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ کمزور اور مظلوم ظلم سہنے اور خون کے گھونٹ پینے پر مجبور ہوتا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

(ب) پاکستانی قانون میں اپیل در اپیل میں بھی سالہا سال بیت جاتے ہیں، جبکہ سعودی نظام عدل میں بھی اپیل کا تصور تو موجود ہے لیکن فریقین کی بجائے قضاۃ کے بارے میں نگرانی کا نظام بڑا سخت ہے تاہم اپلیٹ کورٹ میں فیصلہ کی مدت بھی ایک ماہ سے زیادہ نہیں لگتی۔

(ج) عدالتی فیصلے کے نفاذ کے لیے پہلے سعودی عرب میں جنرل کورٹس کے تحت تنفیذی عدالتیں تقریباً پانچ سال قبل 13/شعبان 1433ھ کو قائم کی گئی تھیں، پھر 22/رمضان 1435ھ (20/جولائی 2014ء)

کو ان عدالتوں کو المحاکم المتخصصة للتنفیذ Special Enforcement Courts کے نام سے مستقل حیثیت دے دی گئی ہے۔ جبکہ پاکستان میں فیصلوں کا نفاذ عدالت کی بجائے انتظامیہ کی ذمہ داری ہے۔

6 **سعودی عدلیہ پاکستانی عدلیہ کی نسبت زیادہ آزاد:** سعودی اور پاکستانی نظام عدل میں یہ بھی فرق ہے کہ پاکستان میں جج حضرات کے انتخاب اور تعین میں انتظامیہ کا زیادہ دخل ہے جبکہ سعودی عرب میں جج حضرات کے انتخاب میں سپریم جوڈیشل کونسل کا زیادہ دخل ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان میں عدالتوں کے فیصلے کا نفاذ انتظامیہ کی ذمہ داری ہے، جبکہ سعودی عرب میں انفورسمنٹ عدالتوں کے قیام کی بنا پر، عدالتی فیصلوں کی فوری اور مؤثر تنفیذ بھی عدالتی دائرۂ عمل کا ہی حصہ ہے۔ اسی طرح پاکستانی جج حضرات، پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند ہوتے ہیں، جبکہ سعودی عرب کے جج حضرات شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند ہیں۔ الغرض ان تین جہات سے سعودی عدلیہ پاکستانی عدلیہ کی نسبت انتظامیہ کے اثر ورسوخ سے زیادہ آزاد ہے۔

نتائج

پاکستان اور سعودی عرب دونوں کے نظامہائے عدل وقانون کے تقابل وتجزیے کے بعد جب ہم مذکورہ بالا نتائج پر پہنچ جاتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کامیاب منزل تک پہنچنے کا راستہ اور طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ اس کے جواب میں بھی میں ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم کی رائے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے لیے تعلیمی اور تربیتی ادارے اور اکیڈمیاں قائم کی جائیں جو ایسے نصابات کی حامل ہوں جن میں خیر کے دونوں پہلوؤں کا امتزاج ہو۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

''جب ان دونوں قوانین کے نصابات پر از سر نو غور کر لیا جائے اور ایک ایسا نظام وضع کیا جائے کہ قانون کی ابتدائی تعلیم ایک حد تک مشترک ہو جس میں فقہ اسلامی میں تخصص کرنے والے حضرات بھی شریک ہوں اور رائج الوقت قوانین میں تخصیص کرنے والے بھی شریک ہوں۔ پھر آگے چل کر جب قانون کے مختلف شعبوں میں اختصاص کا مرحلہ آئے تو فقہ اور اس کے شعبوں میں اختصاص کرنے والے مختلف اداروں

میں چلے جائیں اور جدید قوانین اور اس کے شعبوں میں اختصاص کرنے والے مختلف اداروں میں چلے جائیں۔ اس کے باوجود یہ ضروری ہوگا کہ جو لوگ فقہ اور اس کے شعبوں میں تخصص کر رہے ہوں، وہ اپنے متعلقہ موضوع سے ملتے جلتے شعبہ ہائے قوانین میں بھی ضروری حد تک واقفیت حاصل کریں۔ اسی طرح جو لوگ جدید قوانین کے مختلف شعبوں میں تخصص کر رہے ہوں، وہ اپنے متعلقہ موضوع سے ملتے جلتے شعبہ ہائے قوانین میں بھی ضروری حد تک واقفیت حاصل کریں۔ اسی طرح جو لوگ جدید قوانین کے مختلف شعبوں میں تخصص کر رہے ہوں مثلاً جورس پروڈنس یا بین الاقوامی قانون یا دستوری قانون میں وہ اپنے تخصصات سے متعلق فقہی شعبوں میں کسی حد تک واقفیت پیدا کریں۔"[1]

اس نوعیت کے تعلیمی ادارے قائم کرنے سے ہی معاملہ حل نہیں ہوگا، بلکہ اس کو پھر پاکستان میں مؤثر طور پر نافذ کرنے کے لیے ایک بھرپور تحریک کی بھی ضرورت ہے، جیسا کہ ڈاکٹر غازی مزید لکھتے ہیں:

"اس کے لیے ایک ہمہ گیر قانونی اصلاح اور قانونی تعلیم کی ضرورت ہے جو ایک تحریک کے طور پر پورے پاکستان میں عام کی جائے۔ پاکستان میں فقہ کی تعلیم کے نصاب پر از سر نو اور بنیادی طور پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح قانون کی تعلیم کے وہ تمام ادارے جو پاکستان میں قانون کی تعلیم دے رہے ہیں، ان کے نصابات پر از سر نو غور کیے جانے کی ضرورت ہے۔"[2]

حاصل یہ ہے کہ پاکستان میں اس مقصد کے لیے نہ صرف جوڈیشل اکیڈمیاں قائم کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ایسی عالمی جوڈیشل ٹریننگ انسٹیٹیوٹس بننے چاہییں جن میں عالم اسلام کے جج حضرات اکٹھے ٹریننگ حاصل کریں تاکہ وہ اپنے اپنے ملکوں کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے استفادہ اور افادہ کی فضا پیدا کریں۔

وصلی اللہ علی نبیّنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم



---

[1] 'علم اُصول فقہ، ایک تعارف': ص175

[2] ایضاً: صفحہ 174

گھر کا ماحول

پرسکون اور خوشگوار کیسے بنائیں؟

عبداللہ شمیم [1]

مسائل اور پریشانیاں ہر گھر کا مسئلہ ہے، جس کی وجہ سے گھر میں آرام وسکون نہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے برکتی بھی پیدا ہوتی ہے، ان مسائل سے آگاہی اور ان کا تدراک خوشحال گھرانے کے لیے ضروری ہے۔ سکون، اطمینان اور برکت اللہ تعالیٰ کچھ اسباب کے ذریعے سے فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا ان اسباب کو سمجھ کر اپنے گھروں میں رائج کر کے ماحول کو پرسکون بنانا ضروری بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔

گھر دو چیزوں کا نام ہے، ایک گھر کے در و دیوار، دوسرا گھر میں رہنے والے افراد۔ گھر کی خوبصورتی جہاں در و دیوار سے ہوتی ہے وہیں سکون و اطمینان کے حصول کے لیے، افراد کے باہمی روابط اور خوشگوار ماحول سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک نعمت گھر ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا﴾ (النحل:80)

---

[1] ریسرچ اسکالر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

ترجمہ: ''اور اللہ نے بنایا تمہارے لیے تمہارے گھروں کو آرام وسکون کی جگہ''۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ایک خاص نعمت کا ذکر فرمارہا ہے جو گھر کی صورت میں ہے جو کہ انسان کے لیے جائے پناہ بھی ہے اور مکان استقرار بھی۔ مزید کئی فوائد بھی اسی جگہ سے منسلک ہوتے ہیں''۔ [1]

گھر وہ جگہ ہے جہاں انسان کی عزت محفوظ رہتی ہے، کیونکہ گھر ہی ہے جہاں عورت مستور ہوتی ہے اور اپنے آپ کو محفوظ رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ (الاحزاب:33)

ترجمہ: ''اور اپنے گھروں میں ٹکی رہو اور پہلی جاہلیت کے زینت ظاہر کرنے کی طرح زینت ظاہر نہ کرو''

لہذا گھر وہ نعمت ہے جہاں انسان اپنے اکثر اوقات احسن انداز سے گزارتا ہے گرمی کی شدت اور سردی کی سختی سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔ اپنی خلوت واجتماع کے لمحات بھی یہیں بسر کرتا ہے۔

اس نعمت کا صحیح ادراک ان لوگوں کے مشاہدہ سے ہوتا ہے جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں، جن کی زندگی کے شب وروز کھلے آسمان تلے بسر ہوتے ہیں انہیں آرام کے لیے چاردیواری میسر نہیں ہے۔

اس نعمت کی اہمیت کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''طوبیٰ لمن ملک لسانه ووسعه بیته وبکی علیٰ خطیئة'' [2]

'' کامیابی کی خوشخبری ہے ایسے شخص کے لیے جو اپنی زبان پر کنٹرول رکھتا ہے، اور اس کے لیے اس کا گھر کافی ہے اور اپنے گناہوں پر روتا ہے''۔

تو گھر کے درو دیوار کی کشادگی وتزئین اللہ کی نعمت ہے جس کی قدر کرنا ہمارے لیے لازم ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورۃ النحل:80

[2] معجم طبرانی (2340) صححه الالبانی و صحیح الجامع (3928)

گھر میں برکت سکون اور اطمینان بھی اللہ کی نعمت ہے اور دین اسلام نے حصول برکت کے کچھ اسباب ذکر کیے ہیں، جنہیں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

(1) ایک دوسرے کا احساس

گھر کے افراد کا باہمی ربط اور ایک دوسرے کے حال احوال سے مطلع ہونا شرعی تقاضہ ہے، جب قومِ نوح پر عذاب آیا تو جناب نوح علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں استدعا کی:

﴿وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ﴾ (ھود:45)

ترجمہ: ''اور نوح نے اپنے رب کو پکارا، پس کہا اے میرے رب! بیشک میرا بیٹا میرے گھر والوں سے ہے اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے''۔

سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنے اس بیٹے کی فکر بھی کی جو کہ کافر اور مستحق عذاب تھا۔

جناب ابراہیم علیہ السلام کو ایسی ہی فکر اپنے والد کے لیے تھی چنانچہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ کتنے پیارے اور میٹھے انداز میں اپنے والد کو سمجھانے کی کوشش کی۔

﴿يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا﴾ (مریم:42)

ترجمہ: ''اے میرے پیارے والد! تو اس چیز کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور نہ تیرے کسی کام آتی ہے؟''۔

﴿يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا﴾ (مریم:45)

ترجمہ: ''اے میرے پیارے والد! بیشک میں ڈرتا ہوں کہ تجھ پر رحمان کی طرف سے کوئی عذاب آپڑے، پھر تو شیطان کا ساتھی بن جائے''۔

آخر میں یہ فکر بھی لاحق تھی کہ یہ سرکشی کہیں میرے والد کو برباد نہ کردے۔

یہی ابراہیم علیہ السلام تھے جب فرشتوں نے ان کے سامنے قوم لوط پر عذاب کا ذکر کیا تو فوراً جناب

لوط علیہ السلام کا احساس کرتے ہوئے کہنے لگے ﴿قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا﴾

ترجمہ: ''اس نے کہا اس میں تو لوط ہے''۔

ایک دوسرے کا احساس، ضرورت کے وقت کام آنا سنت انبیاء بھی ہے اور شرعی تقاضا بھی جو کہ سکون واطمینان کی اساس و بنیاد ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ ہم گھر کے ہر فرد کا احساس کریں اور اس حوالہ سے اپنی ذمہ داری ادا کریں۔

(2) نیک سیرت ہم سفر کا انتخاب

ہر گھر کی بنیاد شوہر اور بیوی ہیں، لہٰذا ایسی عورت کو بطور بیوی انتخاب کیا جائے جو اپنے اخلاق وسیرت کے اعتبار سے نمایاں ہو، اور اخلاق وسیرت میں بنیادی امر دین ہے۔ اسی بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

'تنكح المرأة لأربع لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك'[1]

ترجمہ: ''عورت سے چار چیزوں کو سامنے رکھ کر نکاح کیا جاتا ہے (1) مالداری کی وجہ سے (2) حسب ونسب کے سبب (3) حسن وجمال کی وجہ سے (4) دینداری کی وجہ سے''۔ لہٰذا دین دار عورت کو اپنا مطلوب قرار دو، خاک آلودہ ہوں تیرے دونوں ہاتھ۔

نیز فرمایا: ''الدُّنْيَا مَتَاعٌ، وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ''۔[2]

ترجمہ: ''دنیا ساز وسامان ہے اور دنیا کا بہترین سامان نیک بیوی ہے''۔

بلکہ تعلیماً یہ بھی فرمادیا 'لِيَتَّخِذْ أَحَدُكُمْ قَلْبًا شَاكِرًا، وَلِسَانًا ذَاكِرًا ، وَزَوْجَةً مُؤْمِنَةً تُعِينُ أَحَدَكُمْ عَلَى أَمْرِ الْآخِرَةِ'[3]

ترجمہ: ''تمہارے پاس شکر گزار دل ہو، ذکر کرنے والی زبان ہو اور مومنہ بیوی جو آخرت (میں کامیابی) کے امور میں تمہاری مددگار ثابت ہو''۔

[1] صحيح البخاری :باب الأكفاء فی الدين ،كتاب النكاح حديث:5090

[2] صحيح المسلم : باب خير متاع الدنيا والمرأة الصالحة ،كتاب الرضاع حديث:1469

[3] سنن ابن ماجه : باب أفضل النساء،كتاب النكاح،حديث:1856

اسی طرح دوسری جانب شوہر کے انتخاب کے لیے شریعت نے اسی قسم کی تعلیم لڑکی کے ولی کو بھی ارشاد فرمائی ہے، نبی ﷺ کا فرمان: ''إذا أتاكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه، إلا تفعلوا تكن فتنة في الأرض، وفساد عريض''۔[1]

ترجمہ ''تمہارے پاس ایسے شخص کا رشتہ آئے جس کے دین اخلاق سے تم مطمئن ہو تو شادی کروادیا کرو، اگر تم ایسا نہیں کروگے تو یہ امر زمین میں باعث فتنہ فساد بنے گا''۔

لہٰذا رشتہ کے معاملے میں دونوں جانب سے مکمل چھان بین اور تحقیق ہونی چاہیے اور جب اطمینان ہو جائے تو اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے ایک اچھے گھر کی بنیاد رکھی جائے۔

3 اصلاح کی کوشش کرنا

ایک دوسرے کو نصیحت کرنا، سمجھانا شریعت کے بنیادی اصولوں میں سے ہے، اور اس بنیاد کی کامیابی اخلاق حسنہ اور دین میں مضمر ہے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے گھریلو معاملات میں ایک دوسرے کو اچھے انداز سے سمجھانا، اصلاح کرنا، گھر میں خوشگوار ماحول کو قائم رکھتا ہے۔ اور یہ ذمہ داری گھر کے ہر فرد پر اپنی حیثیت کے مطابق ادا کرنا ضروری ہے، نبی ﷺ کا فرمان ہے۔

'كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسؤولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ'[2]

ترجمہ: ''تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی نگہبانی سے متعلق (قیامت کے دن) سوال ہوگا''۔

4 دینی تربیت کا اہتمام کرنا

گھریلو ماحول کی سعادت کا راز دینی تربیت میں پوشیدہ ہے، جتنا گھر میں دین کا اہتمام ہوگا اتنا ہی وہ گھر خوشحال ہوگا۔ جیسا کہ خود نبی ﷺ کا طرزِ عمل بیان کرتے ہوئے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی

---

[1] سنن ابن ماجه: باب الأكفاء كتاب النكاح حديث: 1967

[2] صحيح البخاری: باب قوا انفسكم واهليكم نارا۔كتاب النكاح، حديث: 5188

ہیں:'' کان رسول اللہ ﷺ یصلی من اللیل فاذا أوتر قال قومی فأوتری یا عائشہ''۔[1]

ترجمہ:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کے وقت نماز پڑھتے پھر جب وتر پڑھ لیتے تو فرماتے اے عائشہ اٹھو اور وتر پڑھو''۔

بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعائے رحمت فرمائی ہے، جو آدمی رات میں اٹھ کر نماز ادا کرتا ہے اور پھر اپنی بیوی کو بھی نماز کے لیے اٹھاتا ہے''۔[2]

5 گھر میں ذکر کا اہتمام کرنا

یہ بات مسلّم ہے کہ برکت ورحمت اللہ کی طرف سے آتی ہے اور ذریعہ برکت ذکر الٰہی ہے، گھر میں مختلف انداز کے ذکر مختلف طریقوں سے احادیث میں ملتے ہیں۔

(أ) گھر میں داخل ہونے کی دعا: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:''جب بندہ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے تو داخل ہوتے وقت اور کھانا کھاتے وقت اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ اب یہاں رات گزارنے کی جگہ ہے نہ ہی رات کا کھانا''۔[3]

(ب) گھر سے نکلتے وقت دعا کرنا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے جب بندہ اپنے گھر سے نکلتے ہوئے یہ الفاظ ادا کرتا ہے۔''بسم اللہ توکلت علی اللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ''تو ایسے شخص کے لیے کہا جاتا ہے کہ تیرے لیے کافی ہے۔یقیناً تیری رہنمائی کردی گئی، کفایت کردی گئی اور تجھے بچالیا گیا پھر اس شخص سے شیطان جدا ہوتا ہے اور اس سے دوسرا شیطان کہتا ہے اب کیسے تو اس شخص کا مقابلہ کرے گا جس کی

---

[1] صحیح المسلم :باب صلاۃ اللیل--- کتاب صلاۃ المسافر----- حدیث:744

[2] سنن ابی داؤد:باب قیام اللیل،کتاب الصلاۃ حدیث:1308

[3] صحیح المسلم: کتاب الأشربۃ، باب استحباب تخمیر الإناء، حدیث2018

رہنمائی کفایت اور بچاؤ کیا جا چکا ہے“۔[1]

(ج) **سورۃ بقرہ کی تلاوت کرنا:** رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، بے شک شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔[2]

ایک روایت میں فرمان مبارک یوں بھی وارد ہوا ہے کہ اپنے گھروں میں سورہ بقرہ پڑھا کرو کیونکہ جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جائے وہاں شیطان داخل نہیں ہوتا۔[3]

شیطان کے نزدیک سب سے بہترین کام شوہر اور بیوی میں اختلافات پیدا کرنا ہے جس سے ایک گھر تباہ ہو جاتا ہے جبکہ گھروں میں اس قسم کے ذکر و اذکار اور تلاوت قرآن کا اہتمام شیطان اور شیطانی مکر و فریب سے محفوظ رکھتا ہے۔

6 اولاد کی تربیت

اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہمیشہ ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:6)

ترجمہ: ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ“۔

لہذا گھر کے سربراہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ گھر کے تمام افراد خصوصاً اولاد کی تربیت پر توجہ دے، کیونکہ گھر کا سکھ چین بچوں کی سعادت سے ہے اور بچوں کی سعادت دین میں مضمر ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد: كتاب الأدب، باب مايقول اذا خرج من بيته، حديث:5095

[2] صحيح المسلم: باب استحباب صلاة النافلة كتاب صلاة المسافرين، حديث:780

[3] مستدرک حاکم، 4/25، حدیث:2062

7 باہمی اختلافات تنازعات اور گھریلو جھگڑوں کے معاملات پر تبادلہ خیال بچوں کے سامنے نہ کریں

عموماً یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ میاں بیوی اپنے جھگڑے، شب و روز کی نوک جھونک سب کچھ بچوں کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے۔اس سے بچے نفسیاتی طور پر بہت متاثر ہوتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات تو بات اس حد تک آگے نکل جاتی ہے کہ باپ بچوں سے کہتا ہے اپنی ماں سے بات نہیں کرنا، یا پھر ماں کہتی ہے باپ سے بات نہ کرنا۔ یا پھر اگر کسی رشتہ دار سے اختلاف ہو جیسے عموماً چچا، خالو کے خاندانی اختلاف رہتے ہیں ان اختلافات کو بھی میاں بیوی گھر میں بچوں سے سامنے ڈسکس کرتے ہیں۔اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بچپن سے ہی دشمنیاں پلنا شروع ہو جاتی ہیں۔اور بچے سمجھتے ہیں کہ ہمارا فلاں چچا اچھا ہے اور فلاں بہت برا۔اور جب یہ اولاد بڑی ہوتی ہے تو دو خاندانوں میں بوئے گئے نفرت کے بیج اتنے پختہ ہو چکے ہوتے ہیں کہ قتل و غارت، قطع کلامی، سب و شتم تک بات پہنچ جاتی ہے لہٰذا تمام گھر والوں چاہے ماں باپ ہو، نانا، نانی ہوں۔ یا دادا دادی سب اس بات کا از حد خیال رکھیں کہ خاندانی تنازعات کا ذکر بچوں کی موجودگی میں نہ چھیڑیں۔ بچوں کو ہمیشہ یہ احساس دلائیں کہ سب رشتہ دار آپ سے بے پناہ محبت کرتے اور چاہتے ہیں۔ سب رشتہ دار اکرام و تکریم میں برابر ہیں۔

8 گھر میں ایسے آلات نہ لائیں یا ایسے افراد کو جگہ نہ دیں جو بری عادات و اخلاق کے حامل ہوں

آج کل الیکٹرونک آلات بالخصوص ٹیلیوژن موبائلز کا دور دورہ ہے۔ بچے ہوش سنبھالتے ہی انہیں ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔ بات کارٹوں سے شروع ہوتی ہے اور پھر حیا باختہ پروگرامز کے مشاہدے سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔لہٰذا والدین بہت زیادہ محتاط رہیں کہ فلم، ڈرامے یا پھر موبائلز مستقل بچوں کے ہاتھ میں دینے کے نتائج بہت بھیانک ہو سکتے ہیں۔اسی طرح خادم خادمائیں بھی ایسی نہ رکھیں جو بری عادات

واطوار کی حامل ہوں۔

9 اپنے بچوں کو ٹائم دیں

آپ کتنے بھی مصروف ہوں۔آپ کی اولاد آپ کی ہے اور آپ نے ہی اس کی تربیت کرنی ہے اور اس کے ثمرات سمیٹنے ہیں۔لہذا اپنے بچوں کو ٹائم دیں انہیں سیر وتفریح کیلئے لے کر جائیں، انہیں اچھی اچھی باتیں سکھائیں، قرآن مجید، دعائیں سکھانے کا اہتمام کریں۔سونے سے پہلے اپنی نگرانی میں بچوں سے سوتے وقت کی دعائیں پڑھوائیں، انہیں اچھے اچھے اسلامی واقعات سنا کر ایمان اور اہل ایمان سے محبت ان کے دلوں میں پیدا کریں۔

10 دعا

اپنی کوشش وعمل کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ سعادت وکامیابی توفیق الٰہی کے بغیر ناممکن ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ سے مسلسل دعا کے ذریعے گھروں میں سکون طلب کرنا عباد الرحمٰن کا شیوہ ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ (الفرقان:74)

ترجمہ: ’’اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور اولادوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا‘‘۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان رہنما اصولوں کو اختیار کرنے اور ان پر کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

انہ ولیّ التوفیق

وصلی اللہ علی نبیّنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم



فضائل علی رضی اللہ عنہ
اور
من گھڑت روایات

حافظ محمد یونس اثری [1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ذی شان ہے: " فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي، وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ "[2] " تم پر میری سنت اور خلفاء راشدین جو کہ ہدایت یافتہ ہیں، کی پیروی لازم ہے۔" ان خلفاء راشدین میں سب سے پہلے نمبر پر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، دوسرے نمبر پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، تیسرے نمبر پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور چوتھے نمبر پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت اسلامی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے، آپ کو جہاں خلیفہ رابع ہونے کا شرف حاصل ہے وہیں آپ کے حصے میں یہ مرتبت بھی آئی کہ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچیرے بھائی اور داماد ہیں اور فاتح خیبر ہونے کا شرف بھی آپ کی شخصیت کا ایک ممتاز پہلو ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ان شخصیات میں سے ہیں جنہیں سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں شمار کیا جاتا ہے، مردوں میں سب سے پہلے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، خواتین میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور بچوں میں سب سے پہلے سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایمان لائے، اس کے بعد مکی دور جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے انتہائی کٹھن اور صبر آزما دور تھا، اس موقع پر ہر آن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کھڑے ہوئے، بلکہ ہجرت کی رات سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حصے میں یہ شرف آیا کہ وہ رفیق سفرِ ہجرت بنے

---

[1] ریسرچ اسکالر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

[2] سنن ابی داوٗد: 4607، جامع ترمذی: 2676، وقال ھذا حدیث حسن صحیح، سنن ابن ماجہ: 42، علامہ البانی رحمہ اللہ نے فرمایا یہ حدیث صحیح ہے۔

اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حصے میں یہ شرف آیا کہ انہوں نے اس رات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر آرام فرمایا، اور ہجرت کے بعد بھی آپ کبھی جنگوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں، تو کبھی جنگ تبوک کے موقع پر مدینہ منورہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کی صورت میں، کبھی آپ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کے لیے قاضی اور مبلغ کی حیثیت سے منتخب فرمایا تو کبھی فتح خیبر کے لیے عظیم سپہ سالار کی حیثیت سے منتخب فرمایا۔ بہر حال آپ کی شخصیت کے یہ مختلف جھروکے کتب سیرت اور کتب تاریخ میں بکھرے پڑے ہیں جو کھول کھول کر آپ کے فضائل ومناقب بیان کررہے ہیں۔

ان فضائل ومناقب سے کسی مؤمن کو کوئی انکار ہے نہ ہوسکتا ہے، البتہ کسی ضعیف، موضوع یا من گھڑت روایت سے ثابت منقبت کے اہل توحید وحدیث قائل نہیں، اور جس طرح سلف نے اس قسم کی روایات کی حقیقت کو لوگوں کے سامنے کھول کر نکیر بھی کی اور اس قسم کی روایات کے نشر سے گریز بھی کیا، اہل حدیث کا یہی منہج ہے کہ اس قسم کی مرویات جو دور حاضر میں بھی بڑی شدومد کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں اور جھوٹے قصے اور روایات بیان کر کے قصہ گو واعظین اور ذاکرین پیسہ بھی بٹورتے ہیں اور جاہل عوام کی داد بھی۔ لیکن دنیا کے چند ٹکوں کے لیے شریعت کے ساتھ تحریف وتبدیل کا سلوک جو وہ کرتے چلے جاتے ہیں، اس کی انہیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی، واضح رہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت جو قطعاً اس بات کی محتاج نہیں کہ اس کے لیے من گھڑت روایات کا سہارا لینا پڑے بلکہ ان کی عظمت تو صحیح ثابت شدہ مرویات میں بھرپور بیان ہوئی ہے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی کچھ اسی قسم کا تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

”وفضل علي رضي الله عنه أشهر من أن يستدل عليه بمثل هذه الموضوعات، التي يتشبث الشيعة بها، ويسودون كتبهم بالعشرات من أمثالها، مجادلين بها في إثبات حقيقة لم يبق اليوم أحد يجحدها، وهي فضيلة علي رضي الله عنه.“[1]

”سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت تو اس بات سے کہیں زیادہ مشہور ہے کہ اسے موضوع روایات سے استدلال کر کے بیان کیا جائے، جنہیں شیعہ نے گھڑا اور اس طرح کی دسیوں مرویات کے

---

[1] سلسلة الأحاديث الضعيفة :894

ذریعے اپنی کتب کو سیاہ کر کے رکھ دیا۔ اور اس سے اثبات بھی اس حقیقت (سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت) کا کیا جاتا ہے جس سے کسی کو انکار ہی نہیں"۔

زیر نظر بحث میں ایسی ہی بعض روایات کی تحقیق مقصود ہے تا کہ ان کے بیان اور انہیں عام کرنے سے ہم حد درجہ احتیاط بھی برتیں اور جو لوگ اس قسم کی مرویات بیان کرتے ہیں ان سے بھی محتاط رہیں۔ واضح رہے کہ جیسا کہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا کہ فضیلت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بکثرت من گھڑت روایات موجود ہیں، سب کا احاطہ مقصود نہیں بلکہ ہم یہاں صرف دس روایات کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

پہلی روایت

عن ابن عباس قال :قال رسول الله (صلى الله عليه وسلم): "حب علي يأكل الذنوب كما تأكل النار الحطب"۔[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "علی کی محبت گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے"۔

حکم

اس کی سند میں احمد بن شبویہ مجہول ہے اور محمد بن مسلمۃ ضعیف ہے۔

خطیب بغدادی یہ روایت درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "رجال إِسْنَاده بعد مُحَمَّد بن مسلمة كلهم معروفون ثقات، والْحَدِيث بَاطِل مركب عَن هَذَا الْإِسْنَاد "۔

"اس کی سند میں محمد بن مسلمہ کے بعد سب کا ثقہ ہونا معروف ہے، یہ حدیث باطل ہے اور اس سند سے بنائی ہوئی ہے"۔

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ اسے موضوعات میں لائے ہیں۔[2]

---

[1] تاریخ دمشق:13/52، تاریخ بغداد:5/318

[2] الموضوعات:1/370

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو باطل قرار دیا۔[1]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "ومحمد بن مسلمة سيأتي ترجمته وإنه ضعيف والراوي عنه أحمد بن شبويه هذا مجهول فالآفة من أحدهم"[2]

"محمد بن مسلمہ کا ترجمہ عنقریب آرہا ہے اور وہ ضعیف ہے اور اس سے روایت کرنے والا احمد بن شبویہ مجہول ہے آفت ان میں سے کسی ایک کی طرف سے ہے۔"

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو باطل قرار دیا۔[3]

دوسری روایت

عن حذيفة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من سره أن يحيا حياتي، ويموت ميتتي، ويتمسك بالقصبة الياقوتة التي خلقها الله بيده ثم قال لها: كوني، فكانت، فليتول علي بن أبي طالب من بعدي".[4]

حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جسے یہ پسند ہو کہ وہ میری زندگی جیئے اور میری موت مرے، اور یاقوت سے مرصع موتی حاصل کرے جسے اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا پھر اسے کہا ہو جا، وہ ہو گیا۔ اسے چاہئے کہ وہ میرے بعد علی کو دوست بنائے"۔

حکم

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند میں موجود محمد بن زکریا الغلابی کو متہم قرار دیا ہے۔[5]

---

[1] تلخيص الموضوعات:264

[2] لسان الميزان:588

[3] السلسلة الضعيفة:1206

[4] حلية الاولياء:1/86، 4/174

[5] اللآلیء المصنوعة :1/337

ابن عراق الکنانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی سند میں موجود محمد بن زکریا الغلابی کو متہم قرار دیا۔[1]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو السلسلة الضعيفة میں درج کیا اور موضوع قرار دیا۔ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے شریک بن عبداللہ القاضی پر جرح نقل کی کہ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میرے والد نے اس کی حدیث کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کی سند میں موجود ایک اور شخص محمد بن زکریا الغلابی کو اس حدیث کی اصل آفت قرار دیا اور امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا کہ یہ حدیث گھڑتا تھا، حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے متہم قرار دیا۔[2]

تیسری روایت

ایک روایت عام طور پر بیان کی جاتی ہے کہ خیبر کے موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی عصر کی نماز نکل گئی، اور وجہ یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی گود میں سو رہے تھے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا اسی حال میں سورج غروب ہونے کا وقت ہو گیا، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہوئے تو دعا کی:

"اللّهم إنه كان في طاعتك وطاعة رسولك فاردد عليه الشمس"۔[3]

"اے اللہ! علی رضی اللہ عنہ تیری اور تیرے نبی کی اطاعت میں بیٹھے رہے لہٰذا تو دوبارہ سورج کو لوٹا دے"

اور سورج دوبارہ واپس ہوا اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیدنا علی نے عصر کی نماز ادا کی۔

حکم

مختلف طرق سے یہ روایت مختلف کتب میں موجود ہے لیکن تمام طرق ہی اس کے موضوع درجے کے ہیں، حافظ ذہبی، ابن الجوزی، علامہ سیوطی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور علامہ البانی رحمہم اللہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔[4]

---

[1] تنزيه الشريعة 361/1

[2] السلسلة الضعيفة: 893

[3] شرح مشكل الآثار للطحاوی: 9/2

[4] دیکھئے: السلسلة الضعيفة: 971

چوتھی روایت

”يا عمار بن ياسر! إن رأيت علياً قد سلك وادياً وسلك الناس وادياً غيره؛ فاسلك مع علي؛ فإنه لن يدلك على ردى، ولن يخرجك من هدى“۔[1]

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمار بن یاسر سے فرمایا: اے عمار بن یاسر! اگر تم دیکھو کہ علی ایک راہ پر ہیں اور باقی لوگ دوسری راہ پر تو تم علی کے ساتھ چلنا، کیونکہ وہ تمہیں کسی ہلاکت کی طرف رہنمائی نہیں کریں گے اور نہ ہی تمہیں ہدایت سے نکالیں گے“۔

حکم

امام ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”هَذَا حَدِيثٌ مَوْضُوعٌ بِلا شَكٍّ“[2] یعنی یہ حدیث بلا شک وشبہ موضوع ہے۔ مزید معلیٰ بن عبدالرحمٰن کے بارے میں جرح نقل کی کہ ابن المدینی رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ حدیث گھڑتا تھا، ابوحاتم رازی نے کہا: متروک ہے، ابوزرعہ نے کہا کہ ذاھب الحدیث ہے۔

اس کی سند کے ایک اور راوی احمد بن عبداللہ المؤدب کے بارے میں جرح نقل کی کہ ابن عدی نے کہا کہ یہ حدیث گھڑتا تھا، امام دارقطنی نے کہا کہ متروک الحدیث ہے۔

اور پھر اس کے دیگر طرق کی حقیقت بھی کھول دی۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”مَوْضُوع: والمعلى مَتْرُوك يضعُ وَأَبُو أَيُّوب لَمْ يشْهد صفّين“[3] یعنی یہ حدیث موضوع ہے، معلیٰ متروک ہے، احادیث گھڑتا تھا، اور ابوایوب تو جنگ صفین میں موجود ہی نہیں تھے۔

---

[1] تاریخ دمشق لابن عساکر: 72/42

[2] الموضوعات لابن الجوزی: 12/2

[3] اللآلی المصنوعة: 374/1

امام جورقانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”هذا حديث موضوع لا شك فيه“[1] اس حدیث کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں۔

ابن العراق الکنانی بھی اسے تنزيه الشريعة میں لائے۔[2]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے موضوع قرار دیا ہے۔[3]

پانچویں روایت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”أنا وهذا (يعني: علياً) حجة على أمتي يوم القيامة“۔[4]

”میں اور علی رضی اللہ عنہ قیامت کے دن اپنی امت پر حجت ہوں گے“۔

حکم

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے موضوع قرار دیا۔[5]

اس کی سند میں ایک راوی مطر بن ابی مطر ہے جس کو امام بخاری، ابوحاتم، نسائی نے منکر الحدیث قرار دیا۔[6]

ازدی نے متروک قرار دیا۔[7]

ساجی نے منکر الحدیث قرار دیا۔[8]

---

[1] الاباطيل والمناكير: 329/1

[2] تنزيه الشريعة : 371/1

[3] السلسلة الضعيفة: 4896

[4] تاریخ بغداد للخطیب: 2/88، تاریخ دمشق لابن عساکر: 42/308

[5] السلسلة الضعيفة: 4900

[6] ميزان الاعتدال للذهبی، ترجمة مطر

[7] تهذيب التهذيب ابن حجر، ترجمة مطر

[8] تهذيب التهذيب، ترجمه مطر

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”كان ممن يروي الموضوعات عن الاثبات،يروي عن أنس ما ليس من حديثه في فضل علي بن أَبي طالب وغيره،لا تحل الرواية عنه“[1]

”یہ ان راویوں میں سے ہے جو ثقہ راویوں سے موضوع روایات بیان کرتے ہیں، انس سے علی بن ابی طالب کی فضیلت کے بارے میں وہ روایت بیان کرتا ہے جو ان کی حدیث نہیں ، اس سے روایت لینا جائز نہیں“۔

امام حاکم فرماتے ہیں:”يضع الْأَحَادِيث فِي الْفَضَائِل فيرويها عَن أنس بن مَالك“[2]

”فضائل میں احادیث گھڑ کے انس بن مالک سے بیان کرتا ہے“۔

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے الضعفاء والمتروکین میں درج کیا ہے۔[3]

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد اسے باطل قرار دیا۔[4]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے متروک قرار دیا۔[5]

چھٹی روایت

”لما أسري بي؛ رأيت في ساق العرش مكتوباً: لا إله إلا الله، محمد رسول الله صفوتي من خلقي، أيدته بعلي ونصرته“۔[6]

---

[1] المجروحین:5/3

[2] مستدرک حاکم:170/10

[3] الضعفاء والمتروکین:530

[4] میزان الاعتدال ترجمه مطر

[5] تقریب التهذیب:6703

[6] (أخرجه ابن عساکر:(16/ 455-456)اس میں عمار بن مطر اور ابوحمزة الثمالی مجروح ہیں۔اور صفحہ نمبر(42/ 336) پر ایک اور طریق سے ذکر کیا کہ اس میں عبادہ بن زیادہ، عمرو بن ثابت اور ابوحمزة الثمالی مجروح ہیں۔اس روایت کو امام طبرانی نے المعجم الکبیر میں روایت کیا ہے، (22/ 200)ح526،سند وہی ہے۔اور اسے ابونعیم نے حلیة الاولیاء(3/ 27) میں بیان کیا ہے،اور اس سند میں احمد بن الحسن الکوفی ہے۔

''جب مجھے اسراء کروائی گئی میں نے عرش کے نیچے لکھا دیکھا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں، محمد اللہ کے رسول ہیں اور مخلوق میں سے چنے ہوئے ہیں اور میں نے علی کے ذریعے ان کی مدد کی ہے''۔

حکم

ابوالحمراء سے مروی یہ حدیث تاریخ دمشق لابن عساکر میں دو جگہ موجود ہے، ایک جگہ (16/455،456) پر یہ روایت ''۔۔۔حدثنا عمار بن مطر حدثنا عمر بن ثابت عن أبي حمزة الثمالي عن سعيد بن جبير عن أبي الحمراء قال قال رسول الله (صلى الله عليه وسلم)۔۔۔ الخ'' کی سند سے موجود ہے۔

اس سند سے بھی یہ روایت موضوع کے درجے کی ہے، جیسا کہ ابن عراق الکنانی نے اس سند میں موجود دو راوی عمار بن مطر اور ابوحمزہ الثمالی پر جرح کی کہ یہ رافضی ہیں، ثقہ نہیں ہیں۔[1]

عمار بن مطر

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اشارہ کرتے ہوئے کہ بعض نے اس کی توثیق اور بعض نے اس کا حفظ بیان کیا ہے، اس کے بعد کئی ایک اقوال جو اس پر جرح کے حوالے سے ہیں، نقل کیے:

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ھالک

ابن حبان فرماتے ہیں: '' كان يسرق الحديث ''یعنی یہ احادیث چراتا تھا۔

عقیلی فرماتے ہیں: ثقات سے اکثر مناکیر بیان کرتا ہے۔

ابوحاتم الرازی فرماتے ہیں: جھوٹ گھڑتا تھا۔

ابن عدی کہتے ہیں: اس کی احادیث باطل ہیں۔

دارقطنی فرماتے ہیں: یہ ضعیف ہے۔[2]

---

[1] تنزيه الشريعة: 164

[2] ميزان الاعتدال :6004

ابوحمزۃ الثمالی

اس کا نام ثابت بن ابی صفیۃ ہے، اس کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے ذکر کردہ اقوال درج کیے جاتے ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں: ليس بشئ

امام ابن معین فرماتے ہیں: ليس بشئ

امام ابوحاتم فرماتے ہیں: لين الحديث

امام نسائی فرماتے ہیں: ليس بثقة

حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ سلیمانی نے اسے روافض میں سے شمار کیا ہے۔ [1]

اس کے بارے میں بحوالہ السلسلة الضعيفة کلام آگے آرہا ہے۔

یہ حدیث تاریخ دمشق میں دوسری جگہ (42/336) "حدثنا إبراهيم بن هانئ النيسابوري حدثنا عبادة بن زياد الأسديحدثنا ناعمرو بن ثابت بن أبي المقدام عن أبي حمزة الثمالي عن سعيد بن جبير عن أبي الحمراء خادم رسول الله (صلى الله عليه وسلم) قال سمعت رسول الله (صلى الله عليه وسلم)۔۔۔الخ " کی سند سے موجود ہے۔

اس سند پر علامہ البانی رحمہ اللہ نے روایت کو موضوع قرار دیتے ہوئے تین راویوں عبادۃ بن زیاد الاسدی، عمرو بن ثابت اور ابوحمزۃ الثمالی پر جرح نقل کی ،جن کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

ابوحمزۃ الثمالی

امام دارقطنی فرماتے ہیں: متروک

امام ابن حبان فرماتے ہیں: احادیث میں کثیر الوھم ہے، حتی کہ جب یہ منفرد ہو تو قابل احتجاج نہیں اور یہ غالی شیعہ ہے۔ (مزید اس پر حافظ صاحب کا نقل کردہ کلام گزر چکا۔)

---

[1] میزان الاعتدال: 1358

عمرو بن ثابت

امام ابن معین فرماتے ہیں: ليس بشئى اور ایک مقام پر ليس بثقة ولا مأمون

امام نسائی فرماتے ہیں: متروک الحدیث

امام ابن حبان فرماتے ہیں: موضوع روایات بیان کرتا ہے۔

امام ابوداؤد فرماتے ہیں: یہ رافضی، خبیث ہے۔

عبادۃ بن زیاد

یہ بھی شیعہ ہے، لیکن مختلف فیہ قرار دینے کے بعد اصل آفت اسے قرار نہیں دیتے۔[1]

اسی سند سے یہ روایت المعجم الکبیر میں بھی ہے اور المعجم الکبیر کے حوالے سے علامہ ہیثمی نے اسے نقل کیا اور عمرو بن ثابت پر متروک ہونے کی جرح کی،[2] لہذا اس سند کا حکم بھی موضوع کا ہے۔

یہ روایت حلیۃ الاولیاء میں "۔۔۔ أَحْمَدُ بْنُ الْحَسَنِ الْكُوفِيُّ، قَالَ: ثنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ عُلَيَّةَ، عَنْ يُونُسَ بْنِ عُبَيْدٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنْ أَبِي الْحَمْرَاءِ۔۔۔الخ "کی سند سے ہے[3] جو مذکورہ بالا دونوں سندوں سے مختلف ہے، ابونعیم اس روایت کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں: "غَرِيبٌ مِنْ حَدِيثِ يُونُسَ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ، لَمْ نَكْتُبْهُ إِلَّا مِنْ هَذَاالْوَجْهِ" یعنی یہ یونس بن عبید عن سعید کے طریق سے غریب ہے ہم نے اسے صرف اسی سند کے ساتھ لکھا ہے، گویا کہ ابونعیم رحمہ اللہ اشارہ فرما رہے ہیں کہ باقی اسانید لکھنے کے قابل نہ تھیں۔ لیکن جس سند سے ابونعیم لائے ہیں اس میں بھی احمد بن الحسن الکوفی ہے، جیسا کہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اس روایت کو حلیۃ الاولیاء کے طریق سے نقل کر کے احمد بن الحسن الکوفی کے بارے میں ابن حبان کی جرح نقل کی کہ یہ موضوع روایات بیان کرتا ہے اور دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے

---

[1] السلسلة الضعيفة : 4902

[2] مجمع الزوائد : 14702

[3] حلية الاولياء : 27/3

متروک قرار دیا۔ اور خود بھی علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اس روایت کو لایصح قرار دیا۔ لھذا اس سند کے ساتھ بھی یہ موضوع کے درجے کی ہے۔[1]

ساتویں روایت

''من أراد أن ينظر إلى آدم في علمه،وإلى نوح في فهمه، وإلى إبراهيم في حلمه،وإلى يحيى بن زكريا في زهده، وإلى موسى بن عمران في بطشه؛ فلينظر إلى علي بن أبي طالب''[2]

جو آدم کا علم، نوح کا فہم، ابراہیم کا حلم، یحی بن زکریا کا زہد، موسی بن عمران کی طاقت کو دیکھنا چاہے تو وہ علی کو دیکھ لے۔

علامہ ابن الجوزی نے اسے موضوع قرار دیا۔[3]

علامہ جلال الدین سیوطی نے اس حکم کو برقرار رکھا، البتہ بعض طرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''(قلت) لَهُ طَرِيق آخر عَن أبي سَعِيد قَالَ ابْن شاهين قَالَ الديلمي أَخْبَرَنَا أبي حَدَّثَنَا عَلِيّ بْن دُكَيْن القَاضِي حَدَّثَنَا عَلِيّ بْن مُحَمَّد بن يُوسُف حَدَّثَنَا الْفضل الْكِنْدِيّ حَدَّثَنَا عَبْد اللهِ بْن مُحَمَّد بْن الْحَسَن مولى بني هَاشم بِالْكُوفَةِ حَدَّثَنَا عَلِيّ بْن الْحُسَيْن حَدَّثَنَا مُحَمَّد بْن أبي هَاشم النَّوْفَلِي حَدَّثَنَا عَبَيد الله بْن مُوسَى حَدَّثَنَا الْعَلَاء عَن أبي إِسْحَاق السبيعِي عَن أبي دَاوُد مقنع عَن أبي الْحَمْرَاء بِهِ وَورد عَن أبي سَعِيد قَالَ ابْن شاهين فِي السّنة حَدَّثَنَا مُحَمَّد بْن الْحُسَيْن بْن حميد بْن الرّبيع حَدَّثَنَا مُحَمَّد بْن عمرَان بْن حجاج حَدَّثَنَا عُبَيْد الله بْن مُوسَى عَن أبي رَاشد يَعْنِي الْحمانِي عَن أبي هَارُون الْعَبْدي عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ كُنَّا حَوْلَ النَّبِيِّ فَأَقْبَلَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ فأدام رَسُول الله النَّظَرَ إِلَيْهِ ثُمَّ قَالَ مَنْ أَرَادَ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى آدَمَ فِي عِلْمِهِ

---

[1] العلل المتناهية : 378

[2] تاریخ دمشق لابن عساکر: 42/313

[3] الموضوعات :1/370

وَإِلَى نُوحٍ فِي حُكْمِهِ وَإِلَى إِبْرَاهِيمَ فِي حِلْمِهِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى هَذَا وَاللهُ أعلم.“[1]

ابن عراق الکنانی نے بھی اس حکم کو برقرار رکھا البتہ ابن عباس والے شاھد کو کچھ اس طرح بیان کیا: ”

(قلت) ومن حديث ابن عباس قال ابن بطة ثنا أبو ذر أحمد بن الباغندي ثنا أبي عن مسعر بن يحيى عن شريك عن أبي اسحق عن أبيه عن ابن عباس مرفوعا: " من أراد أن ينظر إلى آدم في علمه وإلى نوح في حكمته وإلى إبراهيم في خلته فلينظر إلى علي، " وقال الذهبي في الميزان: مسعر بن يحيى النهدي لا أعرفه وخبره منكر انتهى، وأبو الحمراء، قال البخاري: يقال له صحبة ولا يصح حديثه والله أعلم. “ ۔[2]

السلسلة الضعيفة میں علامہ البانی نے اس روایت کو موضوع قرار دیتے ہوئے علامہ سیوطی رحمہ اللہ اور ابن العراق کے بیان کردہ طرق کا جائزہ بھی پیش کر دیا۔ جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

پہلی سند جس میں عبید اللہ بن موسی کے شاگرد محمد بن مسلم بن وارہ ہیں، اس سند میں عبید اللہ کا استاذ ابو عمرو الازدی متروک ہے۔

دوسری سند جس میں عبید اللہ بن موسی کا شاگرد محمد بن ابی ہاشم النوفلی ہے، اس میں عبید اللہ بن موسی کا استاد علاء ہے اور وہ روایت کرتے ہیں ابو اسحاق السبیعی سے اور ان کا استاد ابو داؤد مقنع کو حافظ ابن حجر نے متروک اور ابن معین نے کذاب قرار دے رکھا ہے، لہذا یہ سند بھی موضوع ہوئی۔

تیسری سند میں عبید اللہ بن موسی کا شاگرد محمد بن عمران بن حجاج ہے، اور عبید اللہ بن موسی کے استاد ابو راشد الحمانی روایت کرتے ہیں کہ ابو ھارون العبدی سے، وہ ابو سعید خدری سے۔ اس سند میں ابو ھارون العبدی جس کا نام عمارۃ بن جوین شیعہ تھا، متروک راوی ہے، بعض نے کذاب بھی کہا۔ لہذا یہ سند بھی موضوع

---

[1] اللآلی المصنوعة :1/325

[2] تنزیه الشریعة :1/385

کے درجے کی ہے۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ اس مفہوم کی تمام اسانید خواہ ابوحمراء سے مروی ہوں یا ابوسعید سے یا ابن عباس سے یا انس سے سب موضوع کے درجے کی ہیں۔

آٹھویں روایت

"يا علي! لك سبع خصال، لا يحاجك فيهن أحد يوم القيامة: أنت أول المؤمنين بالله إيماناً، وأوفاهم بعهد الله، وأقومهم بأمر الله، وأرأفهم بالرعية، وأقسمهم بالسوية، وأعلمهم بالقضية، وأعظمهم مزيةً يوم القيامة"۔[2]

"اے علی! تیری سات خصلتیں ہیں قیامت کے دن ان کے بارے میں تجھ سے کوئی جھگڑا نہیں کرے گا۔ تو سب سے پہلے ایمان لانے والا ہے، اور اللہ کے عہد کو سب سے زیادہ پورا کرنے والا ہے اور اللہ کے امر کو سب سے زیادہ قائم کرنے والا ہے اور رعیت سے سب سے زیادہ پیار کرنے والا ہے، اور سب سے زیادہ برابر تقسیم کرنے والا، اور معاملے کو سب سے زیادہ جاننے والا اور قیامت کے دن خصوصیت و مرتبہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ اعظم ہوگا"۔

اس روایت کی سند میں عصمہ بن محمد کذاب ہے جو احادیث گھڑتا تھا۔ ابن معین نے اس کے بارے میں کہا کہ یہ کذاب ہے، احادیث گھڑتا تھا، عقیلی نے کہا کہ ثقہ راویوں سے باطل روایات بیان کرتا ہے۔

علامہ سخاوی نے اس سمیت چند ایک روایات ذکر کر کے فرمایا: و كلها واهية۔[3] "سب کمزور ہیں"۔

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔[4]

---

[1] السلسلة الضعيفة : 4903

[2] حلية الاولياء لأبی نعیم الأصبهانی: 66/1

[3] مقاصد الحسنة : 135/1

[4] السلسلة الضعيفة : 4913

نویں روایت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”النظر إلى علي عبادة“

یعنی: ”علی کی طرف دیکھنا عبادت ہے“۔[1]

حکم

یہ روایت بھی موضوع ہے۔

امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اس کے تیرہ (13) طرق پیش کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا ”هذا الحديث لا يصح من جميع طرقه“ اس حدیث کی تمام طرق صحیح نہیں ہیں۔[2]

علامہ البانی رحمہ اللہ اس روایت کو موضوع قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ روایت عبداللہ بن مسعود، عمران بن حصین، عائشہ، أبوبکر الصدیق، أبو ہریرۃ، أنس بن مالک، معاذ بن جبل، عثمان بن عفان، وغیرھم سے بیان کی جاتی ہے اور ان تمام اسانید پر کلام نقل کیا۔[3]

تنبیہ

بعض کا اسے روایت متواتر[4] قرار دینا صحیح نہیں کیونکہ اس کا کوئی طریق صحیح ثابت نہیں۔ اور بعض کا اس کے کسی طریق کو صحیح قرار دینا بھی صحیح نہیں[5]، جیسا کہ امام ابن الجوزی اور علامہ البانی رحمہ اللہ کے تفصیلی

---

[1] مستدرک حاکم :4681، عن عمران بن حصین و4682 عن عبداللہ ، حلية الاولياء لأبي نعيم الأصبهاني:182/2، عن عائشة ،تاریخ بغداد: --- عن ابی هريرة

[2] الموضوعات : 358/1، حدیث نمبر : 13

[3] تفصیل کے لیے دیکھئے:السلسلة الضعيفة :4702

[4] جیسا کہ صاحب نظم المتناثر (243) نے علامہ سیوطی کے حوالے سے کہا کہ کثرت طرق کی بنا پر وہ اسے متواتر شمار کرتے ہیں۔

[5] جیسا کہ امام حاکم نے صحیح قرار دیا اور اس پر تعاقب کرتے ہوئے، حافظ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں اس روایت کو موضوع قرار دیا۔

کلام کی طرف مراجعت سے واضح ہوجائے گا۔اسی طرح بعض کا اس روایت کثرت طرق کی بنیاد پر حسن لغیرہ قرار دینا بھی درست ہیں۔ [1]

دسویں روایت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:"أنا مدينة العلم وعلي بابها، فمن أراد العلم فليأته من بابه"
"میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں، پس جو علم کا ارادہ رکھتا ہے، وہ اس کے پاس دروازے سے آئے"۔ [2]

حکم

یہ روایت موضوع ہے بعض نے کثرت طرق کی بنیاد پر اسے حسن کہا، جو کہ صحیح نہیں، جیسا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس پر تفصیلی کلام فرمایا ہے، جس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

ابن جریر نے تہذیب الآثار میں، طبرانی نے المعجم الکبیر میں، امام حاکم نے المستدرک میں، خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں، ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ابن عباس سے مرفوعاً روایت کی۔

امام حاکم نے اسے صحیح الاسناد کہا تو حافظ ذہبی نے اس پر نقد کرتے ہوئے موضوع قرار دیا۔

امام حاکم نے ابوالصلت کو ثقہ، مامون قرار دیا تو اس پر بھی حافظ ذہبی نے تعاقب کیا اور کہا کہ یہ ثقہ اور مامون نہیں۔

انہوں نے اپنی کتاب الضعفاء والمتروکین میں کہا کہ کئی ایک نے اسے متہم بالکذب قرار دیا۔ابو

---

[1] جیسا کہ علامہ شوکانی نے الفوائد المجموعہ میں یہ بات کہی اور حاشیہ میں اس پر علامہ معلمی نے نقد کرتے ہوئے کہا علامہ شوکانی کا یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ بعض طرق کی حالت پر خود علامہ شوکانی مطلع نہیں ہو سکے۔

[2] المعجم الکبیر للطبرانی:11061،المستدرک علی الصحیحین للحاکم :4637،4638،عن ابن عباس، المستدرک علی الصحیحین : 4369، عن جابر، جامع ترمذی:۔۔۔عن علی و لفظہ أنا دار الحکمۃ وعلي بابها وقال الترمذی: منکر

زرعہ نے کہا: ثقہ نہیں، ابن عدی نے کہا کہ متھم ہے۔ دیگر نے کہا کہ رافضی ہے، اور حافظ ابن حجر نے کہا: صدوق، منکر روایات بیان کرتا ہے اور شیعہ تھا، مزید کہا کہ عقیلی نے اسے کذاب کہہ کر افراط سے کام لیا۔

علامہ البانی فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ ابن معین کے علاوہ اس کی کسی نے توثیق نہیں کی اور ابن معین سے بھی متعدد روایات اس پر جرح یا تعدیل کے حوالے سے پانچ مختلف روایات ذکر کرتے ہوئے کہا اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ابن معین بالجزم اس کی توثیق نہیں کی، مزید یہ کہ ابن معین سے اس حدیث کے حکم کے تعلق سے بھی پانچ مختلف روایات مروی ہیں۔ جن میں سے اکثر اس حدیث کی تضعیف کی طرف مائل ہیں۔

اس کی چھ متابعات ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ " فهؤلاء ستة متابعين لأبي الصلت، ليس فيهم من يقطع بثقته" یہ چھ متابعین ہیں ابو الصلت کے جن میں سے قطعی طور پر کسی ایک بھی توثیق ثابت نہیں۔

پھر مزید یہ کہ روایت کرنے والے اعمش ہیں جو مجاھد سے بالعنعنة روایت کر رہے ہیں، حالانکہ وہ مدلس ہیں، حافظ ابن حجر اور یعقوب بن شیبہ کی صراحت کے مطابق اعمش کی مجاھد سے بہت کم ہی روایات سنی ہیں، اور ان میں سماع کی صراحت جو دس کے قریب ہیں، اور مذکورہ روایت میں تصریح سماع نہیں۔ مزید یہ کہ وہ باقی مرویات مجاھد سے لیث یا ابو یحی القتات کے واسطے سے لیتے ہیں، اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔

اس کا ایک شاہد سیدنا علی سے مروی ہے جس کے الفاظ ہیں " انا باب الحكمة و علی بابها" اسے خود امام ترمذی نے منکر قرار دیا۔

اس کا ایک اور شاہد سیدنا جابر سے مروی ہے، جو کہ مستدرک حاکم اور تاریخ بغداد میں ہے۔

اس کے الفاظ ہیں: "هذا أمير البررة، وقاتل الفجرة، منصور من نصره، مخذول من خذله، - يمد بها صوته -، أنا مدينة العلم...." "یہ نیک لوگوں کے امیر، فاجروں کے قاتل ہیں، جو ان کی مدد کرے گا وہ مدد کیا جائے گا اور جو انہیں رسوا کرے گا وہ رسوا کیا جائے گا، آپ نے ان کلمات کے ساتھ اپنی آواز کو بلند کیا اور پھر فرمایا کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔"

امام حاکم نے یہ روایت ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ”اسناده صحيح“ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس پر نقد کیا اور فرمایا: ”العجب من الحاكم وجرأته في تصحيح هذا وأمثاله من البواطيل، وأحمد هذا دجال كذاب “

”حاکم (رحمہ اللہ) کی جرأت پر تعجب ہے کہ ایسی باطل قسم کی روایات کو صحیح قرار دے رہے ہیں اور یہ احمد تو دجال اور کذاب ہے۔“

دوسری جگہ فرمایا: ”بل و الله موضوع، و أحمد كذّاب، فما أجهلك على سعة معرفتك“

”یہ حدیث تو موضوع ہے اور احمد کذاب ہے، (اور آپ کا اس حدیث کو صحیح قرار دینا) آپ کی کتنی بڑی ناواقفیت ہے باوجود اس کے کہ آپ وسیع معرفت رکھتے ہیں۔

اس کا تیسرا شاہد جو کہ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کے دو طریق ہیں۔

ایک طریق پیش ہے: ”عن محمد بن جعفر الشاشي: أخبرنا أبو صالح أحمد بن مزيد: أخبرنا منصور بن سليمان اليمامي: أخبرنا إبراهيم بن سابق: أخبرنا عاصم بن علي: حدثني أبي عن حميد الطويل عنه مرفوعا به“ اس پر علامہ البانی رحمہ اللہ نے تبصرہ فرمایا: ”وهذا إسناد ضعيف مظلم، من دون عاصم بن علي لم أعرف أحدا منهم، ووالد عاصم - وهو علي بن عاصم بن صهيب الواسطي - ضعيف“

”عاصم بن علی سے نیچے یہ سند تو ضعیف اور اندھیروں پر مبنی ہے، ان میں سے میں کسی ایک کو نہیں جانتا، اور عاصم کا والد، علی بن عاصم بن صہیب الواسطی بھی ضعیف ہے۔“

دوسرا طریق ”عن عمر بن محمد بن الحسين الكرخي: أخبرنا علي بن محمد بن يعقوبلليودعي: أخبرنا أحمد بن محمد بن سليمان قاضي القضاة بـ (نوقان): حدثني أبي: أخبرنا الحسن بن تميم بن تمام عن أنس بن مالك به دون الزيادة، وزاد: ".... وأبو بكر وعمر وعثمان سورها، وعلي بابها..."“

اس پر علامہ البانی رحمہ اللہ نے تبصرہ فرمایا: ابن عساکر نے اس کو روایت کرنے کے بعد سند اور متن دونوں لحاظ سے منکر قرار دیا۔ علامہ البانی کہتے ہیں بلکہ باطل روایت ہے اور اس کا بطلان واضح ہے۔

خلاصہ یہ ہے اس باب کی تمام روایات اپنے متابعات وشواہد کے ساتھ صحیح کے درجے تک نہیں پہنچتی بلکہ موضوع ہی ہیں، اور آخر میں علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کے متن پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کلام نقل فرمایا کہ یہ روایت متن کے اعتبار سے بھی موضوع ہے چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وحديث"أنا مدينة العلم وعلى بابها"أضعف وأوهى، ولهذا إنما يعد في الموضوعات وإن رواه الترمذي، وذكره ابن الجوزي وبين أن سائر طرقه موضوعة، والكذب يعرف من نفس متنه، فإن النبي صلى الله عليه وسلم إذا كان مدينة العلم، ولم يكن لها إلا باب واحد، ولم يبلغ العلم عنه إلا واحد؛فسد أمر الإسلام. ولهذا اتفق المسلمون على أنه لا يجوز أن يكون المبلغ عنه العلم واحد، بل يجب أن يكون المبلغون أهل التواتر الذين يحصل العلم بخبرهم للغائب، وخبر الواحد لا يفيد العلم بالقرآن والسنن المتواترة. وإذا قالوا: ذلك الواحد المعصوم يحصل العلم بخبره. قيل لهم: فلابد من العلم بعصمته أولا، وعصمته لا تثبت بمجرد خبره قبل أن نعرف عصمته لأنه دور ولا إجماع فيها. ثم علم الرسول صلى الله عليه وسلم من الكتاب والسنة قد طبق الأرض، وما انفرد به علي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فيسير قليل، وأجل التابعين بالمدينة هم الذين تعلموا في زمن عمر وعثمان. وتعليم معاذ للتابعين لأهل اليمن أكثر من تعليم علي رضي الله عنه، وقدم علي على الكوفة وبها من أئمة التابعين عدد: كشريح، وعبيدة، وعلقمة، ومسروق، وأمثالهم "۔

’’یہ حدیث ضعیف اور کمزور ترین ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے موضوعات میں شمار کیا گیا ہے، گو کہ اسے ترمذی نے روایت کیا۔ ابن الجوزی نے اسے ذکر کیا اور اس کے تمام طرق کا موضوع ہونا بیان کیا۔ اور جھوٹ تو اس کے متن سے ہی معلوم ہو رہا ہے کیونکہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہر علم ہیں، اور اس کا ایک ہی دروازہ ہے، نبی کا علم بس اس ایک ہی دروازے سے پہنچتا تو اس طرح اسلام کا معاملہ خراب ہو جاتا، یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ یہ جائز ہی نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مبلغِ علم

بس ایک ہو، بلکہ ضروری ہے کہ مبلغین بڑی تعداد میں ہوں جن کی خبر سے علم غیر حاضر لوگوں تک پہنچے، اور خبر واحد علم کا فائدہ نہیں دیتی، (الا یہ کہ دیگر قرائن اس کے ساتھ مل جائیں، اور جب یہ قرائن موجود نہ ہوں، یا اکثر لوگوں سے مخفی ہوں، تو قرآن یا سنن متواترہ کا علم حاصل نہیں ہوگا۔) جب وہ یہ کہیں کہ اس واحد معصوم (علی رضی اللہ عنہ) کی خبر سے علم حاصل ہوجائے گا۔ جواب یہ ہے کہ علم کے لیے پہلے عصمت ضروری ہے اور عصمت صرف خبر کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی، جب تک کہ معروف نہ ہو، کیونکہ عصمت گھومتی ہے (باقی ائمہ شیعہ کے بارے میں بھی) اور یہ عصمت اجماع سے ثابت نہیں، پھر علم الرسول، کتاب و سنت سے پوری زمین میں پھیلا ہوا ہے، اور علی رضی اللہ عنہ سوائے چند روایات کے اس علم کے بیان میں منفرد نہیں ہیں، اور بڑے بڑے جلیل القدر تابعین نے دور عمر، دور عثمان میں علم حاصل کیا، سیدنا معاذ کا تابعین اور اہل یمن کو تعلیم دینا سیدنا علی کی تعلیم سے زیادہ ہے، جب علی کوفہ آئے وہاں ائمہ تابعین میں سے ایک تعداد موجود تھی، جیسا کہ شریح، عبیدہ، علقمہ، مسروق اور دیگر۔ انتھی [1]

بہرحال ان دس روایات کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے، ورنہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ روایات روافض نے اہل بیت اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے فضائل اور سیدنا معاویہ وغیرہ کے خلاف گھڑیں، اور جب بغیر تحقیق کے روایات بیان کرنے کا سلسلہ شروع ہوا، بس یہیں سے یہ بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا، جس کا واحد حل صرف صحیح روایات کا انتخاب، اور صرف ان کتابوں کی طرف رجوع جن میں صحیح روایات کو بیان کیا جاتا ہے، مثلاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے مطالعے کے حوالے سے صحیح روایات پر مبنی چند ایک کتب کی طرف رہنمائی پیش خدمت ہے:

کتب احادیث میں سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، مناقب پر مشتمل ابواب موجود ہیں، جن میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بھی باب ہے، اور وہ صرف صحیح روایات پر مشتمل ہے، اسی طرح جامع ترمذی میں بھی

---

[1] السلسلة الضعيفة :2955

مناقب کا باب موجود ہے جس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ موجود ہے۔ اور اس کی بھی اکثر روایات صحیح ہیں، اور ضعیف روایات کی محققین کی طرف سے نشاندہی کر دی گئی ہے،

اسی طرح صحابہ کے حوالے سے عربی میں لکھی گئی بنیادی کتب جن میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی الاصابة فی تمییز الصحابه ، ابن الأثیر کی اسد الغابۃ وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔

اور اکرم ضیاء العمری کی "عصر الخلافة الراشدة" ڈاکٹر علی محمد الصلابی کی "أسمی المطالب في سيرة أمير المؤمنين علي بن أبي طالب" اس کا اردو ترجمہ بھی بنام "سیدنا علی رضی اللہ عنہ شخصیت اور کارنامے" دارالسلام سے شائع ہوا، سیف اللہ خالد صاحب کی اردو میں کتاب "سیرت علی المرتضیٰ" دارالاندلس سے طبع ہوئی، یہ بھی بڑی مفید کتاب ہے۔ ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے ملنے والے اسباق کو اپنے لیے بھی نمونہ سمجھا جائے اور اسی طرز پر زندگی بسر کی جائے۔

واللہ ولی التوفیق